تعلیم و تربیت
یا اللہ!
ہم سب کو ماہ رمضان کی رحمتوں اور برکتوں
سے فیض یاب فرما! آمین
جولائی 2013ء
ٹوٹا ہوا تارا

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: برکت والا مہینہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حضرت ابراہیمؑ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپؑ ہمیشہ ایک نہ ایک آدمی کو اپنے کھانے میں شریک کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، کئی دن گزر گئے اور حضرت ابراہیمؑ کے گھر کسی مہمان کا گزر نہ ہوا۔ آپؑ نے بھی کھانا نہ کھایا۔ آخر تیسرے چوتھے دن گھر سے باہر نکلے۔ اتفاق سے ایک بوڑھے سے ملاقات ہوگئی۔ آپؑ بوڑھے کو اپنے ساتھ لے آئے۔ گھر والوں نے دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بسم اللہ پڑھ کر لقمہ توڑا لیکن بوڑھا خدا کا نام لیے بغیر ہی ہاتھ بڑھا کر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ لوگوں نے ٹوکا کہ "بڑے میاں! اگر کوئی آدمی کھانے کے وقت بھی اس سچے روزی دینے والا کا نام نہ لے، تو شرم کی بات ہے۔"

بوڑھے نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر کہا۔ "نہ میں تمہارے خدا کو مانوں اور نہ تمہارا کھانا کھاؤں۔" بوڑھے کی یہ بات حضرت ابراہیمؑ کو بہت بُری لگی۔ آخر ایک آدمی نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ بوڑھے کے باہر نکلتے ہی حضرت ابراہیمؑ پر وحی نازل ہوئی کہ "اے ابراہیم! سو برس ہو گئے، ہم نے تو اس کے انکار پر بھی اسے دونوں وقت اچھے سے اچھا کھانا کھلایا، گرمی سردی کے کپڑے دیے اور تندرستی عطا کی اور تم اس کے ایک وقت کے کھانے سے اتنے بیزار ہو گئے کہ گھر سے نکال دیا۔"

حضرت ابراہیمؑ نے یہ سنا تو حیران رہ گئے، فوراً گھر سے باہر نکلے، بوڑھے کو تلاش کیا، منت سماجت کر کے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لائے، تپاک سے اپنے پاس بٹھایا اور کھانا کھلایا۔ بچو! اس چیز سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات رب العالمین اپنی مخلوق پر بڑی مہربان اور غفور و رحیم ہے۔

اس ماہ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو جائے گا۔ اس مبارک مہینے میں رحمتوں اور برکتوں کی بارش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق دے۔ آمین!

گرمی کا موسم شروع ہو چکا ہے، اس موسم میں چلنے پھرنے اور کھانے پینے میں بہت احتیاط برتنی چاہیے۔ تیز دھوپ میں باہر نہ نکلیں۔ اگر کہیں جانا ہو تو خوب پانی پیجیے اور کسی کپڑے سے سر اور چہرہ ڈھانپ کر باہر نکلیے۔ ہلکی پھلکی اور جلد ہضم ہونے والی خوراک کھائیے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کو اچھے کاموں میں گزاریں۔ خوب دل لگا کر پڑھیں لیکن اپنے آپ کو درسی کتابوں تک ہی محدود نہ رکھیں۔ جو بچے صرف درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ کولہو کے بیل کی مانند ہوتے ہیں جو ایک ہی دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ اس لیے نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ فرصت کے وقت ایسی غیر نصابی کتابیں بھی پڑھنی چاہیے جن سے آپ کے علم میں اضافہ ہو۔

اب اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء اور تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

حمد باری تعالیٰ
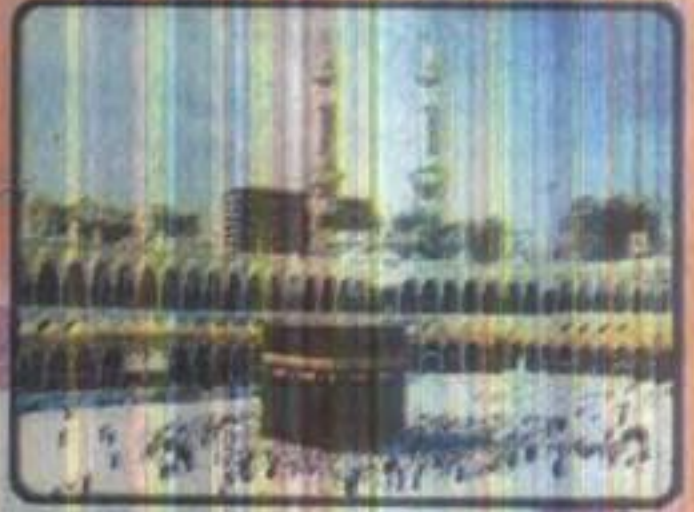
کروں کیوں نہ تعریف تیری خدایا
کہ تو نے ہے سارے جہاں کو بنایا
کہیں پھول پتے ہیں تو نے کھلائے
کہیں پہ ہیں دریا سمندر بنائے
کہیں پہ چرندے، پرندے، درندے
کہیں پہ محبت سے معمور بندے
کہیں زندگی کی ہے زندہ کہانی
کہیں پربتوں پہ ہوا کی روانی
کہیں شاخ گل لہلہاتی چمن میں
کہیں خس کی خوشبو ہے دشت و دمن میں
کہیں پہ ہے غم اور کہیں پہ ہاؤ ہو ہے
جدھر دیکھتا ہوں فقط تو ہی تو ہے

نعت رسول مقبول

نعت لکھتا ہوں نعت کہتا ہوں
اک عجب بے خودی میں رہتا ہوں
پھول ہوتے ہیں ان کی مدحت کے
میں جنھیں ہار میں پروتا ہوں
یاد کرتا ہوں سبز گنبد کو
آنکھ کو آنسوؤں سے دھوتا ہوں
آپؐ کے جو بلالؓ و بوذرؓ تھے
میں انھیں یاد کرتا رہتا ہوں
وہ اُحد ہو کہ خیبر و خندق
فتح و نصرت کے باب پڑھتا ہوں
ہو کرم آپؐ کا کرامت پر
ہر گھڑی مشکلوں میں رہتا ہوں

مدحت: تعریف
معمور: بھرا ہوا
پربت: پہاڑ
دشت: صحرا
دمن: ٹیلا، پہاڑی
ہاؤ ہو: خوشی
خس: سوکھی گھاس

کرامت بخاری

درسِ قرآن و حدیث

فضائلِ رمضان

محمد طیب الیاس

پیارے بچو! آپ کے اسکول میں کسی معزز شخصیت کی آمد ہو تو اسکول کے پرنسپل اور انتظامیہ آپ کو مہمان شخصیت کا تعارف کرواتے ہیں اور آداب و تمیز کے بارے میں ہدایات جاری کرتے ہیں تا کہ مہمان کے سامنے کسی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور آپ اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ ان ہدایات پر عمل کریں گے اور مہمان شخصیت کا بھرپور طریقے سے استقبال کریں گے۔ بالکل اسی طرح رمضان کا مبارک اور مقدس مہینہ آ رہا ہے جو 29 یا 30 دن ہمارے پاس مہمان رہے گا۔ یہ مہینہ کن کن فضائل اور خوبیوں کا مالک ہے اور ہمیں اس کا استقبال کیسے کرنا ہے اور اس میں کیا کیا اعمال کرنے چاہیے، اس بارے میں ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ہمیں ہدایات جاری فرمائی ہیں۔

حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے مہینہ کی آخری تاریخ میں ہم لوگوں کو وعظ فرمایا:
(۱) تمہارے اوپر ایک مہینہ آ رہا ہے، بہت مبارک مہینہ ہے۔
(۲) اس میں ایک رات (شب قدر) ہے جو ہزاروں مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزہ کو فرض فرمایا۔
(۴) اس رات کے قیام (تراویح) کو ثواب کی چیز بنایا ہے۔
(۵) جو شخص اس مہینہ میں کسی نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے ایسا ہے جیسے کہ غیر رمضان میں فرض کو ادا کیا اور جو شخص اس مہینہ میں کسی فرض کو ادا کرے وہ ایسا ہے جیسے کہ غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے۔ (۶) یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ (۷) یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غم خواری کرنے کا ہے۔
(۸) اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ (۹) جو شخص کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے، اس کے لیے گناہوں کے معاف ہونے اور آگ سے خلاصی کا سبب ہو گا اور روزہ دار کے ثواب کی مانند اس کو ثواب ہو گا مگر اس روزہ دار کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ روزہ افطار کرائے، تو آپ نے فرمایا کہ (روزہ افطار کرانا پیٹ بھر کر کھلانے پر موقوف نہیں) یہ ثواب تو اللہ جل شانہٗ ایک کھجور سے کوئی افطار کرا دے یا ایک گھونٹ پانی پلا دے یا ایک گھونٹ لسی پلا دے اس پر بھی مرحمت فرما دیتے ہیں۔ (۱۰) یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اوّل حصہ (پہلے دس دن) اللہ کی رحمت ہے اور درمیانی حصہ (بیچ کے دس دن) مغفرت ہے اور آخری حصہ (آخری نو یا دس دن) آگ سے آزادی ہے۔ (۱۱) جو شخص اس مہینہ میں اپنے غلام کے بوجھ کو ہلکا کر دے گا، حق تعالیٰ جل شانہٗ اس کی مغفرت فرماتے ہیں اور آگ سے آزادی عطا فرماتے ہیں۔ (۱۲) دو چیزوں کی اس میں کثرت رکھا کرو جن میں سے دو چیزیں اللہ کی رضا کے واسطے ہیں اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے تمہیں چھٹکارا نہیں۔ پہلی دو چیزیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کرو: وہ کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت ہے اور دوسری دو چیزیں جن سے تمہیں چھٹکارا نہیں، یہ ہیں کہ: جنت کو طلب کرو اور آگ سے پناہ مانگو۔
(۱۳) جو شخص کسی روزہ دار کو پانی پلائے حق تعالیٰ (قیامت کے دن) میرے حوض (حوض کوثر) سے اس کو ایسا پانی پلائیں گے جس کے بعد جنت میں داخل ہونے تک پیاس نہیں لگے گی۔

(صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر: ۱۸۸۷، بیہقی، حدیث نمبر: ۳۶۰۸)

پیارے بچو! یقیناً آپ ماہِ رمضان کی برکات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ خوب تلاوتِ قرآن کیا کریں کیوں کہ رمضان ہی کے مہینہ میں قرآن پاک کا نزول بھی ہوا ہے۔ نیز پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات پر عمل کریں۔

عید کی آمد آمد تھی۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ برف باری رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مری کی مال روڈ جہاں صبح سیاحوں کی وجہ سے رونق ہی رونق ہوتی ہے، رات گئے بلا کی سردی میں ایک غریب لڑکی تنہا اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ نہ اُس کا سر ڈھانپا ہوا تھا اور نہ ہی پاؤں میں جوتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلی تو وہ پاؤں میں اپنی ماں کے سلیپر پہنے ہوئے تھی جو اُس کے پاؤں سے کہیں بڑے تھے۔ راستے میں دو سیاح گھڑ سواری کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے وہ دوڑی تو اس کے جوتوں میں سے ایک نیچے کھائی میں گر گیا اور دوسرا ایک شرارتی لڑکا لے اڑا۔ اس لیے غریب چھوٹی لڑکی کو ننگے پیر چلنا پڑا جو پہلے سرخ تھے مگر اب سردی سے نیلے ہو رہے تھے۔ اس کی قمیص کی جیبوں میں ماچس کی چند ڈبیاں تھیں جو وہ بیچنے کے لیے لائی تھی۔ ان ڈبیوں میں سے ایک ماچس کی ڈبیا اس کے ہاتھ میں تھی۔ سارا دن اس سے کسی نے ماچس کی ایک ڈبیا بھی نہیں خریدی تھی۔ ترس کھا کر ہی سہی، اسے کسی نے ایک سکہ دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ بے چاری کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ سردی سے اس کی جان نکل رہی تھی اور اس کی بے بسی کی داستان اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ برف کے نرم گالے روئی کی طرح اس کے چہرے پر آئے ہوئے گھنگھریالے بالوں پر گر رہے تھے۔

اِدھر ہوٹلوں کے کمروں میں روشنیاں جگ مگ کر رہی تھیں اور فضا میں ابھی تک مختلف کھانوں کی ہلکی ہلکی خوشبو رچی ہوئی تھی جو غریب لڑکی کو مزید احساس دلا رہی تھی کہ وہ بھوکی ہے۔ اس کے ذہن میں عید کے بارے میں خیال آ رہا تھا جو کل صبح تھی۔

وہ کشمیر پوائنٹ کی طرف مڑی تو ایک گھر کے باہر اسے ایک چھجا بنا ہوا دکھائی دیا جس کے اندر وہ بیٹھ گئی اور اس نے اپنے دونوں پاؤں کھینچ کر اپنے جسم کے نیچے کر لیے۔ اب سردی ناقابل برداشت تھی۔ سارے دن میں کوئی پیسہ نہ کمانے کی وجہ سے وہ گھر بھی نہیں جا سکتی تھی کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ اس کا باپ ہمیشہ کی طرح بُری طرح مارے گا۔ یوں بھی اس کے گھر میں سردی کون سی کم تھی۔ اس کے گھر والوں نے مل جل کر گھر کی دیواروں میں بننے والے بڑے بڑے سوراخوں کو بڑی مشکل سے گھاس پھوس اور سرکنڈوں سے بند کیا ہوا تھا۔ ان سوراخوں میں سے جب ہوا تیزی سے گزرتی تو ایسا لگتا جیسے چڑیلیں چیخیں مار رہی ہوں۔ اس کے ننھے ہاتھوں میں اب بالکل جان نہیں تھی۔ پھر اس کا دھیان اپنے ہاتھ میں تھامی ماچس کی طرف گیا کہ کیوں نہ وہ ایک ماچس استعمال کر لے۔ اس نے ماچس کی ڈبیا میں سے ایک تیلی نکالی اور

اسے جلایا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ تیلی میں سے شعلہ نکلا جیسے کوئی موم بتی جل رہی ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ کو شعلے کے گرد لپٹا لیا۔ لڑکی کو آناً فاناً یوں لگا جیسے وہ کسی خوب صورت چولہے کے نزدیک بیٹھی ہوئی ہے۔ چولہے میں آگ جل رہی ہے اور اس کی تمازت اس کے سارے جسم میں حرارت پہنچا رہی ہے۔ ابھی وہ اپنے ذہن میں سوچ ہی رہی تھی کہ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اپنے پاؤں کو گرمی پہنچائے کہ تیلی کا شعلہ بجھ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا تصوراتی چولہا بھی!!!

اب پھر وہی جان لیوا سردی تھی اور اس کے ہاتھ میں بجھی ہوئی ماچس کی تیلی۔ اس نے نئی تیلی جلائی۔ شعلہ دوبارہ بلند ہوا اور اس کی روشنی ساتھ والی دیوار پر پڑی۔ چشم زدن میں اسے ایسا گمان ہونے لگا کہ اسے دیوار کے پار نظر آ رہا ہے۔ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں دیوار کے پار دیکھا تو اسے ایسے لگا جیسے کمرے میں کھانے کی میز بچھی ہوئی ہے اور اس پر سفید بے داغ چادر ہے۔ میز کے اوپر خوب صورت برتنوں میں انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ پھر تو جیسے کمال ہی ہو گیا، اس نے تصور میں دیکھا کہ ایک بڑی پلیٹ جس میں بہترین کھانا ہے خود بخود میز سے ہوا میں بلند ہوئی اور ہوا میں تیرتی ہوئی غریب لڑکی کے پاس آ گئی۔ اس نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر پلیٹ میں کچھ کھانے کو لے مگر شعلہ پھر بجھ گیا۔ ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا اور سارا منظر ختم ہو گیا۔

اس نے جلدی سے ایک اور تیلی روشن کی تو اس بار اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی مٹھائی اور کھلونوں والی دکان میں ہے۔ پوری دکان میں برقی قمقمے روشن ہیں۔ عید کا موقع ہے اور کئی بچے دکان میں ہیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ دکان میں ہے۔ چھوٹی بچی نے اپنے ہاتھ پھیلائے کہ وہ ان چیزوں کو جلدی سے سمیٹ لے مگر اسی اثناء میں تیلی دوبارہ ختم ہو گئی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دکان کی ساری روشنیاں آسمان کی طرف اُڑ گئیں۔ اس نے اوپر دیکھا تو اسے لگا جیسے تمام برقی قمقمے اور بتیاں آسمان پر تارے بن گئے ہوں۔ تبھی ان تاروں میں سے ایک تارا ٹوٹا اور ایک لمبی روشنی کی دم بناتا ہوا آسمان کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ یہ سماں ایسے لگ رہا ہے جیسے کوئی مر رہا ہے۔ ایسی بات اسے اس کی دادی اماں نے بتائی تھی کہ جب کوئی ستارا آسمان پر ٹوٹتا ہے تو کسی انسان کی روح آسمان کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔

اس کی دادی اماں بہت مشفق تھیں۔ وہ جب تک زندہ رہیں اسے ہمیشہ پیار کرتی رہیں۔ وہ واحد ہستی تھیں جن سے اس غریب نادار بچی کو زندگی میں پیار ملا تھا۔ بے چاری لڑکی نے جیسے تیسے ماچس کی ایک تیلی اور روشن کی تو شعلے کی روشنی سے ایک ہالہ سا بن گیا اور روشنی کے اس ہالہ میں اس نے اپنی دادی اماں کو دیکھا۔

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے، مگر دادی اماں اسے واضح نظر آ رہی تھیں اور ہمیشہ کی طرح اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

وہ چلائی کہ دادی اماں مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے پتا ہے کہ جیسے اندھیرا ہوا تم غائب ہو جاؤ گی۔ ویسے ہی جیسے گرم چولہا غائب ہو گیا، جیسے کھانا غائب ہو گیا اور جس طرح کھلونے اور مٹھائیاں غائب ہو گئیں۔ پھر اس نے جلدی جلدی تیلیاں جلانا شروع کر دیں کہ کسی طرح روشنی رہے اور اس کی دادی اماں اس کے پاس ہی رہیں۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک ماچس کی تیلیاں جلیں گی، روشنی رہے گی اور دادی اماں اس کے پاس رہیں گی۔ ماچس کی تیلیاں جلنے سے اندھیرے میں بھی دن کا سماں ہو گیا۔ دادی اماں اسے کبھی اتنی خوب صورت نہیں لگی تھیں، جتنی اب لگ رہی تھیں۔

انہوں نے ننھی لڑکی کو اپنی بانہیں پھیلا کر مضبوطی سے اپنی گود میں لے لیا اور وہ دونوں جیسے روشنی کے ہالے میں سفر کرتی ہوئیں زمین سے اتنی بلند ہو گئیں جہاں نہ اب بھوک تھی، نہ درد کا احساس تھا اور نہ ہی جان لیوا سردی کیوں کہ اب وہ زمین سے دُور اور خدا کے زیادہ نزدیک تھیں۔

صبح عید کی نماز کے لیے لوگ سردی میں طرح طرح کے گرم کپڑے پہنے گھروں سے نکلے تو انہوں نے غریب لڑکی کو ایک گھر کے باہر دیکھا جس کے گال سرخی سے تمتما رہے تھے۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی، مگر وہ مر چکی تھی۔ سخت سردی میں وہ تقریباً جم ہی گئی تھی۔

اس کے قریب جلی ہوئی ماچس کی تیلیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لوگ افسوس کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کس طرح لڑکی نے جان بچانے کے لیے ماچس کی تیلیوں کا سہارا لیا ہو گا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ مرنے سے پہلے اس نے کتنے حسین منظر دیکھے تھے اور نہ کسی کو یہ پتا تھا کہ کس طرح وہ اپنی دادی کی بانہوں میں بیٹھ کر روشنی کے ہالے میں سفر کرتے ہوئے خدا کے پاس چلی گئی تھی۔

پیارے بچو! اپنے خوشی کے لمحات میں ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ مفلس اور ناداروں کی دل سے مدد کریں تا کہ وہ بھی زندگی کی خوشیوں میں حصہ لے سکیں۔

سلسلہ ”کھوج لگائیے“ میں ان بچوں کے جوابات بھی درست تھے۔

محمد عبداللہ ہاشم، لاہور۔ نورالہدیٰ خان، لاہور۔ عفیرہ، اسلام آباد۔ عبداللہ نذیر، چکوال۔ محمد اسامہ وحید، ہری پور۔ محمد ثمین احمد، ڈیرہ غازی خان۔ محمد عادل عمران، لاہور۔ سیف اللہ خلیق راجہ، واہ کینٹ۔ ابتہال سلیم، حیدر آباد۔ اسامہ ظفر، سرائے عالم گیر۔ محمد عیان بخاری، دریا خان۔ محمد منصور، فیصل آباد۔ امیر حیدر، تونسہ شریف۔ محمد طیب ریاض، اسلام آباد۔ محمد آصف جمال، لاہور۔ رمشاء عمران، پشاور۔ شاہ ویز خان، فیصل آباد۔ بلال طاہر، راول پنڈی۔ عمر اقبال، کراچی۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ لائبہ کمال، راول پنڈی۔ عبداللہ بن نعیم، مظفر گڑھ۔ ملیحہ رحمٰن رانا، کلور کوٹ۔ ہما ارجمند عروج، رحیم کوٹ۔ ناصرہ بی بی، شیخوپورہ۔ سلیمان علی، واہ کینٹ۔ سبحان الٰہی بٹ، سیال کوٹ۔ قدسیہ وقار، لاہور۔ عائیزہ ممتاز، لاہور۔ حارث رشید، شیخوپورہ۔ عبدالباسط، کبیر والا۔ اشمل افضل، لاہور۔ کوثر کومل، اسلام آباد۔ وانیا نثار احمد، لاہور۔ معروشہ عزیز، لاہور۔ عبدالمقیت، لاہور۔ صباحت تنویر، پشاور۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ محمد ابوبکر رمضان، لاہور۔ محمد اسماعیل حبیب، لاہور۔ تیمیہ حسین، اسلام آباد۔ سعد اللہ، اوکاڑہ۔ عکس عائشہ، ملتان۔ طہیرہ راٹھور، جھنگ۔ محمد حبیب الرحمٰن، جہلم۔ رابعہ حسن، چکوال۔ اسامہ خٹک، پشاور۔ صفاء رشید، کراچی۔ عائشہ شاہد، اسلام آباد۔ سید حیدر ابراہیم، ایبٹ آباد۔ حسیب بدر، بورے والا۔ عبدالرحمٰن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ عائشہ شاہد، اسلام آباد۔ انوشہ فاطمہ، رحیم یار خان۔ محمد علی حسن، کراچی۔ صہیب، ضلع کوہاٹ۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ ثمر خان، بھکر۔ محمد عثمان علی، جھنگ صدر۔ مریم فاروق، راول پنڈی۔ اظہر طاہر، لاہور۔ نور فاطمہ، لاہور۔ وردہ نور، چکوال۔ ارحہ حورین، فقیر والی۔ عامر علی صدیقی، ڈیرہ غازی خان۔ اریبہ صابر، لاہور۔ محمد سعد اللہ، اسلام آباد۔ محمد واصف، بہاول پور۔ شانزہ مجاہد، اسلام آباد۔ حنان عارف، فیصل آباد۔ مہتاب احمد، کرک۔ تلمیز شہزاد، راول پنڈی۔ محمد عثمان، گجرات۔ فرحان اشرف، بہاول نگر۔ فاطمہ زاہدہ، اسلام آباد۔ سعد خالد، گوجرانوالہ۔ حسالہ ندیم، کاموکی۔ حافظ محمد الیاس خان، لاہور۔ نمرہ اعجاز، فیصل آباد۔ حسیب الرحمٰن تبسم، ڈی آئی خان۔ انیقہ اسحاق، راول پنڈی۔ محمد جنید، اٹک۔ عائشہ صدیقی، لاہور۔ سید زہیر انس گیلانی، کوہاٹ۔ طلحہ سمید، وہاڑی۔ جویریہ شکیل، لاہور۔ صدف امین، لاہور۔ شہیر احمد خان، واہ کینٹ۔ کرن قیصر، وزیر آباد۔ شایان طاہر، راول پنڈی۔ حمائل طاہر، گوجرانوالہ۔ اقراء اللہ رکھا، کمالیہ۔ محمد جنید مغل، راول پنڈی۔ محمد سعد ملک، راول پنڈی۔ عروج ندیم، مردان۔ عائشہ ہاشمی، میاں والی۔ حمزہ احمد میر، سیال کوٹ۔ ماہ نور طارق، اسلام آباد

برکت والا مہینہ

ماہِ رمضاں آیا بچو! ماہِ رمضاں آیا
ابر خدا کی رحمت کا ہے دیکھو ہر سُو چھایا
روزے فرض ہیں ہم پر دیکھو روزے سب ہی رکھو
کر کے عبادت اپنے رب کی شاد دلوں کو کر لو
بخشش کے دن رات ہیں ہر پل نیکیاں خوب کماؤ
جو مجبور ہیں بڑھ کے خوشی سے ان کے تم کام آؤ
مانو جو احکامِ رب ہیں پاؤ گے سوغاتیں
ہے یہ مہینہ برکت والا جگ مگ دن اور راتیں
یاد یہ رکھو روزے دارو، فرماں اپنے رب کا
روزے میرے لیے ہیں اس کا اجر میں خود ہی دوں گا
کرو تلاوت قرآں کی اور مانگو دعائیں رب سے
مل کے رہیں سب پاک وطن میں نفرت دل سے بھلا کے

ضیاء الحسن ضیا

انجام

عبدالرشید فاروقی

رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل ٹولیوں کی شکل میں منڈلاتے پھر رہے تھے۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج ماحول کو بھیانک بنا رہی تھی۔ رحمت علی بے چینی سے، اپنے گھر کے کچے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں۔ ایک کونے میں اس کی بیوی زلیخا چادر تانے سو رہی تھی۔ اچانک بڑے زور سے بادل گرجا اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش کے آنے کی دیر تھی، زلیخا بھی اُٹھ بیٹھی۔ رحمت علی کی آنکھوں میں زمانے بھر کی پریشانی تھی۔

''اب کیا ہوگا، ہماری فصل کھیت میں پڑی رہی تو برباد ہو جائے گی، میں نے اس بار کتنی محنت کی تھی۔'' رحمت علی نے زلیخا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں کھڑے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، بھائی کرموں کو ساتھ لے جاؤ اور جتنی فصل آ سکتی ہے، لے آؤ۔'' زلیخا نے چارپائی اندر رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... تو گامے پتر کو اُٹھا دے، چل جلدی کر، میں بھائی کرموں کو بلاتا ہوں۔'' رحمت علی نے تیزی سے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ کرموں کے گھر کے پاس پہنچا اور قدرے اُونچی آواز سے بولا: ''بھائی کرموں...... او بھائی کرموں!!''

چند لمحوں بعد کرموں دروازے پر آیا اور بولا:

''کیوں بھائی رحمت علی! کیا ہوا؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''یار! تمہیں تو پتا ہے، میری ساری فصل کھیت میں کٹی پڑی ہے، صبح تھریشر لگے گا، لیکن بھائی! یہ بارش تو برباد کر دے گی اسے، میرے ساتھ آؤ، دونوں بھائی مل کر کچھ نہ کچھ تو بچا ہی لیں گے۔'' رحمت علی ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔

''وہ...... وہ...... میں......'' اس کی بات سن کر کرموں ہکلایا۔

''کیا ہوا بھائی کرموں...... خیر تو ہے۔''

''وہ......وہ...... میری بیوی بیمار ہے اور ساتھ میں چھوٹا بیٹا منظور بھی۔ تم ہی کہو، میں انہیں اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں بھلا۔''

''بھائی! میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ اللہ کرم کرے گا، تم میرے ساتھ آ جاؤ۔'' رحمت علی کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

''نہ بھائی، میں ان حالات میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا ہوں۔'' کرموں نے بے رُخی سے کہا اور گھر کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

رحمت علی کو اپنے دوست کرموں سے ایسے رویے کی ذرا بھی اُمید نہیں تھی۔ انکار سن کر وہ دھک سے رہ گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ بارش میں کھڑا ہے۔ وہ پلٹا اور اپنے کھیت کی جانب جانے لگا۔ اس نے ہاتھ میں تیز روشنی والی ایمرجنسی لائٹ پکڑی ہوئی تھی۔

تھی۔ بارش اتنی شدید تھی کہ ذرا سی دیر میں گاؤں کی کچی گزر گاہیں خراب ہو کر رہ گئی تھیں۔ رحمت علی جب اپنے کھیت میں پہنچا تو اس کا بیٹا گاما چھوٹی سی لائٹ لیے پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ وہ گندم کے گٹھے اُٹھا کر گدھا گاڑی پر رکھ رہا تھا۔

''ارے گامے پتر! اتنی جلدی آ گیا تو۔'' رحمت علی نے کہا۔

''ہاں ابا جی! پر وہ چچا کرموں کہاں ہے، نظر نہیں آ رہا ہے۔'' گامے نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے، حیرت سے کہا۔

''اس نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتا ہے، اس کی بیوی اور چھوٹا بیٹا بیمار ہے۔''

''لیکن ابا جی......'' گامے نے کچھ کہنا چاہا...... رحمت علی نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا، بولا: ''کچھ مت کہو...... وہ میرا دوست ہے۔''

''ابا جی......''

''چھوڑ گامے پتر...... بارش اور تیز ہو رہی ہے، تو ریڑھی کو لے جا اور آتے ہوئے گھر سے تین چار موٹے کپڑے یا ترپال ضرور لیتے آنا...... جا جلدی کر۔''

''اچھا ابا جی۔'' گامے نے کہا اور ریڑھی لیے گھر کی طرف چل پڑا۔

''ہم ریڑھی پر کتنی گندم ڈھو سکیں گے بھلا، خیر! جتنی بچا سکتے ہیں، اتنی تو ضرور بچائیں گے، باقی اللہ مالک ہے۔'' رحمت علی نے ریڑھی کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کام میں لگ گیا۔

وہ گٹھوں کو اُٹھا کر تیزی سے، درختوں کے جھنڈ کے نیچے رکھنے لگا۔ یہ جھنڈ کھال کے ساتھ ساتھ تھے۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ اچانک اس کے کھیت میں ایک شخص آ نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تیز روشنی والی لائٹ تھی۔ یہ بخشو تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحمت علی کی آنکھوں سے جیسے شعلے سے نکلنے لگے:

''تم...... تم...... میرے کھیت میں کیوں آئے ہو؟'' اس نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری مدد کرنے۔'' بخشو نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن...... لیکن تم تو میرے دشمن ہو۔'' رحمت علی نے جلدی سے کہا۔ اب اس کے چہرے پر حیرت ہی حیرت تھی۔

''میں تمہیں دشمن نہیں سمجھتا ہوں میرے دوست، یہ صرف تمہارا خیال ہے۔'' بخشو نے اطمینان سے جواب دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ رحمت علی مزید کچھ کہتا، بخشو گٹھے اُٹھا کر درختوں کے جھنڈ کے نیچے رکھنے لگا۔ پھر اچانک وہ چونک اُٹھا اور بولا:

''ارے! میں تو اپنا گڈا یعنی بیل گاڑی لے کر آیا ہوں، رحمت علی جلدی کرو، گٹھے اُٹھا کر میرے گڈے پر رکھتے جاؤ۔'' یہ کہہ کر بخشو خود بھی تیزی سے گٹھے اُٹھانے لگا۔ رحمت علی نے چند لمحے کچھ سوچا، پھر حرکت میں آ گیا۔ ذرا سی دیر میں بہت سی گندم گڈے کے اوپر پہنچ چکی تھی اور بخشو اس پر ایک بڑی ترپال ڈال چکا تھا۔

''ہم ریڑھی اور گڈے کی مدد سے بہت ساری فصل بچانے میں کام یاب ہو جائیں گے، ان شاء اللہ...... بس ذرا محنت کرنا ہوگی۔'' بخشو نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر رحمت علی سے مخاطب ہوا:

''جاؤ، یہ اپنے گھر رکھ آؤ، میں گاما کی مدد کرتا ہوں۔'' بخشو نے کہا اور سامنے سے آتے ہوئے گاما کی طرف دیکھنے لگا۔ رحمت علی گڈے کے اُوپر بیٹھ گیا اور پھر وہ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ بارش کی شدت میں اب کمی آ چکی تھی۔

بخشو کی مدد سے رحمت علی اپنی فصل خراب ہونے سے بچانے میں کام یاب ہو گیا تھا۔

''اچھا بھائی رحمت! اب میں چلتا ہوں، گھر میں بچی بیمار ہے۔'' بخشو نے گڈے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... زاہدہ بیمار ہے...... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا...... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' رحمت علی نے جلدی سے کہا۔

''نہیں...... رہنے دو، تم اپنی فصل کی فکر کرو، اس بار تم نے بڑی محنت کی ہے اس پر۔'' بخشو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے دوست! ہماری صلح ہو چکی ہے۔'' رحمت علی بھی مسکرایا۔

''ہاں! لیکن......'' بخشو نے کہنا چاہا۔

''چلو، جلدی کرو۔'' رحمت علی نے گڈے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' بخشو نے کندھے اُچکائے اور بیلوں کو ہانکنے لگا۔

......☆......

چوہدری فضل دین کی بیٹھک میں اس کے خاص آدمی بیٹھے

تھے۔ خود وہ ایک طرف بیٹھا حقے کے کش لے رہا تھا۔ اس نے بیٹھک میں موجود لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا:

”سنا تم لوگوں نے...... رحمت علی اور بخشو کی صلح ہو گئی ہے۔“

”جی چوہدری صاحب...... ایسا ہی ہے...... ہم سب حیران ہیں، ان کی صلح ہو کیسے گئی؟“ کرموں نے حیرت سے کہا۔

”رات کھیت سے فصل اُٹھانے میں بخشو نے رحمت علی کی مدد کی تھی۔“ مھنگے چمار نے کہا۔

”ہاں! ایسا ہی ہوا ہوگا...... وہ میرے پاس آیا تھا، لیکن میں نے بہانہ کر دیا تھا۔“ کرموں نے منہ بنا کر کہا۔

”اوہ...... یہ بہت بُرا ہوا، ان کی دوستی ایک بار پھر ہمارے لیے مشکلات پیدا کر دے گی۔“ چوہدری فضل دین کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

”اب ہم کیا کریں چوہدری صاحب؟“

”وہی جو پہلے کیا تھا...... انہیں ایک بار پھر لڑا دو۔“

”ایسے کاموں میں کرموں بھائی سب سے بہتر ہیں...... پچھلی مرتبہ بھی انہوں نے ہی......“ اچھو قصائی کہتے کہتے رُک گیا۔

”لیکن اب میں یہ کام نہیں کر سکتا ہوں...... رحمت اب میری چال میں نہیں آئے گا...... بخشو اسے تمام باتیں بتا چکا ہو گا۔“ کرموں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اب ہم کیا کریں؟“ چوہدری فضل دین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہم کیا کر سکتے ہیں چوہدری صاحب!!“ موٹے سے ایک آدمی نے فکرمندی سے کہا۔

”کیا ہم یہ برداشت کر لیں کہ وہ دونوں اپنا اناج اُگائیں اور شہر جا کر اچھے داموں فروخت کر کے خوب منافع کمائیں، پھر اُن کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ نہیں بھائی! یوں ہمارا نقصان ہو گا کیوں کہ ہم ان سے سستے داموں اناج خریدتے ہیں۔“ چوہدری فضل دین نے کہا۔

اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا اور بولا:

”چوہدری صاحب! رحمت علی بیل چھوڑ گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ اسے اب آپ کے بیلوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اوہ...... وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا...... یقیناً بخشو نے رحمت علی کے کان بھرے ہوں گے، وہ بہت سمجھ دار ہے...... لیکن اب کیا ہوگا۔“ چوہدری فضل دین نے پگڑی اُتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”چوہدری صاحب! میرے لیے کوئی حکم؟“ کمالے نے پوچھا۔

اس کی بات سن کر فضل دین سر جھکا کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

”بس ٹھیک ہے...... میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی ہے۔ تم لوگ جاؤ، میں ان دونوں کو دیکھ لوں گا۔“ چوہدری فضل دین نے اچانک سر اُٹھا کر کہا۔ سب لوگ چلے گئے۔ وہ چند لمحے وہیں بیٹھا رہا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا اُٹھا اور گھر کے اندر چلا گیا۔

”ہوں...... تو یہ سب کرموں، چوہدری فضل دین اور اس کے چمچوں کا کیا ہوا تھا۔“ رحمت علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں! بھائی رحمت علی، تم بہت سادہ اور شریف ہو، یہ تمہاری سادگی اور شرافت ہی ہے کہ میں تمہارے اتنا قریب ہوں...... کرموں بہت چالاک اور مکار شخص ہے...... اس نے بڑی چالاکی سے ہمیں ایک دوسرے سے دُور کر دیا تھا، اس نے ایسا یقیناً چوہدری فضل دین کے کہنے پر کیا ہوگا، ظالم فضل دین نے بہت عرصہ ہمیں بے وقوف بنایا، ہم سے سستے داموں اناج اور دیگر اجناس خریدتا رہا ہے، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، ہم اپنی چیزیں شہر جا کر فروخت کیا کریں گے اور یوں اچھا منافع کمائیں گے......“

”بالکل...... ہم ایسا ہی کریں گے...... بھائی بخشو! کیا کرموں اور فضل دین آرام سے بیٹھ جائیں گے۔“ رحمت علی نے کہا۔

”میرا خیال ہے...... کرموں تو اب ہمارے قریب بھی نہیں آئے گا، البتہ فضل دین ایک بار پھر ہمیں لڑانے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے یا پھر کچھ اور...... خیر، اس بار وہ منہ کی کھائے گا۔“ بخشو نے کہا۔

”ہم اب کسی کو بھی اپنے درمیان نہیں آنے دیں گے...... ہمارا اتفاق پورا گاؤں دیکھے گا۔“ رحمت علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جیسے پہلے دیکھتا تھا۔“

”ایسا ہی ہوگا، ان شاء اللہ...... چلو اپنے کھیت ٹھیک کرنے چلیں، رات کی بارش نے خوب تباہی مچائی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے...... آؤ۔“

''کمالے! تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے، کیا تم تیار ہو؟''
چوہدری فضل دین نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان سے کہا۔

''چوہدری صاحب! آپ حکم دیں، میں اور میرے بندے...... ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' کمالے نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر سنو......'' چوہدری فضل دین نے مسکراتے ہوئے کہا اور کمالے کو اپنا منصوبہ بتانے لگا۔

''ہوں...... میں سمجھ گیا، آپ فکر ہی نہ کریں۔'' کمالے نے پوری بات سن کر کہا۔

''ذرا احتیاط سے۔''

''چوہدری صاحب! آپ فکر نہ کریں، سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تو پھر تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔''

''ٹھیک ہے، چوہدری صاحب!'' کمالے نے کہا اور چوہدری کی بیٹھک سے نکل گیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

......☆......

''چل اب تو بھی سو جا۔'' رحمت علی نے زلیخا سے کہا۔ وہ اُٹھ کر اپنی چارپائی کی طرف چلی گئی۔

''میں سوچ رہی تھی کہ یہ مٹکا بھی دھو لوں۔'' اس کی نظر چارپائی کے پاس پڑے مٹکے پر تھی۔

''اللہ کی بندی! اللہ نے رات آرام کے لیے بنائی ہے...... مٹکا صبح دھو لینا۔'' رحمت علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

رات کے قریباً دو بجے ایک آدمی اُن کے گھر کی بیرونی دیوار پر چڑھا اور پھر دیوار کو پکڑ کر نیچے لٹک گیا۔ پھر اُس نے آرام سے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ چند لمحے تو دیوار کے قریب کھڑا جائزہ لیتا رہا...... پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ فوراً ہی اس کے ساتھی اندر آ گئے۔ یہ کمالا اور اُس کے ساتھی تھے۔

''لگتا ہے...... سب سو رہے ہیں۔'' کمالے کے ایک ساتھی نے سرگوشی کی۔

''ہاں......''

وہ سب احتیاط سے اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے، جہاں رحمت علی، اس کی بیوی زلیخا اور گاما سو رہے تھے۔ اچانک کمالے کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور آہستہ سے بولا:

''جو چیز ہاتھ لگے...... اُٹھا لو...... لیکن ذرا احتیاط سے۔''

اس کے ساتھی اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ کمالا ایک مرتبہ پھر کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر، اس پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ شاید رحمت علی کی بیوی سونے سے پہلے کنڈی لگانا بھول گئی تھی۔ دروازے کے کھلتے ہی کمالے کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ رحمت علی اور اس کی بیوی زلیخا بے خبر سو رہے تھے۔

کمالے نے ایک نظر زلیخا پر ڈالی اور پھر رحمت علی کی طرف

بڑھنے لگا۔ ایک ایک قدم احتیاط سے اُٹھاتا وہ رحمت علی کی چارپائی کے نزدیک ہو رہا تھا۔

رحمت علی کی چارپائی کے قریب پہنچ کر وہ رُک گیا اور پھر اس کا ہاتھ جیب سے ہوکر باہر نکلا تو اس میں سیاہ رنگ کا ریوالور تھا۔ اس نے ایک نگاہ ریوالور پر ڈالی ...... اچانک ایک ہاتھ اس کی گردن پر اور دوسرا ریوالور والے ہاتھ پر آ جما۔ اس اچانک افتاد پر وہ گھبرا اُٹھا۔

''تم سمجھ رہے تھے کہ میں بے خبر ہوں گا...... پاگل۔''

رحمت علی کی سرگوشی اُبھری تو کمالے کی آنکھیں حیرت وخوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے اُس کی حیرت سے فائدہ اُٹھایا اور ایک جھٹکا مارا...... آن کی آن میں ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا...... اگلے چند لمحات میں کمالا بے ہوش ہو چکا تھا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ کمالے کو منہ سے آواز نکالنا بھی نصیب نہ ہوئی۔ اُسے چارپائی پر لٹا کر رحمت علی دروازے کی جانب بڑھا۔ پھر اس کے منہ سے ایک خوف ناک قہقہہ بلند ہوا۔ باہر کمالے کے ساتھی بوکھلا اُٹھے۔ وہ گھبرا کر گھر کے بیرونی دروازے کی طرف دوڑے۔ ایک نے کنڈی کھولی تو سب جلدی سے باہر نکل گئے۔

رحمت علی مسکراتا ہوا واپس کمرے میں آیا تو زلیخا اور گاما جاگ چکے تھے۔

''ابا جی! یہ کیا تھا......'' گامے نے حیرت سے پوچھا۔

''بتاتا ہوں ...... پہلے جاکر دروازہ بند کر آؤ۔'' رحمت علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

گاما حیران و پریشان اُٹھا اور دروازہ بند کر آیا۔

''ارے...... یہ کیا؟'' زلیخا کی نظر جونہی بے ہوش کمالے پر پڑی، اُس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

رحمت علی بولا:

''یہ کمالا ہے...... چوہدری فضل دین کا آدمی ...... شاید مجھے قتل کرنے آیا تھا، لیکن میں منصوبے کے مطابق تیار تھا...... بھائی بخشو کو پہلے ہی اس بات کا شک تھا کہ چوہدری فضل دین ہماری صلح کو برداشت نہیں کرے گا، اس لیے ہم دونوں ہر طرح کے حالات کے لیے تیار تھے۔''

''اوہ......'' زلیخا اور گامے کے منہ سے نکلا۔

''فکر والی کوئی بات نہیں ...... گامے پتر! تو جا اور بخشو کو بلا لا۔''

رحمت علی نے حیران و پریشان کھڑے گامے سے کہا تو وہ بھاگ کر گھر سے نکل گیا۔ پندرہ منٹ بعد بخشو وہاں موجود تھا اور تمام قصہ سن چکا تھا۔

''اب کیا کریں...... یہ چوہدری تو ہمیشہ سے ہمارا دشمن رہا ہے۔'' بخشو نے پریشان ہوکر کہا۔

''کیوں نہ ہم گاؤں والوں کو ساری حقیقت بتا دیں......'' زلیخا نے تجویز پیش کی۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے میں شہر میں موجود اپنے دوست سے بات کروں گا۔'' رحمت علی نے کہا۔

''شہر میں تمہارا کون سا دوست ہے بھائی رحمت علی؟'' بخشو نے حیرت کا اظہار کیا۔

''تم اُسے نہیں جانتے ...... وہ محکمہ سراغ رسانی میں ملازمت کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، یہ لو میرا موبائل، اس سے فون کرلو۔'' بخشو نے اپنا موبائل نکال کر رحمت علی کو دیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی کا گتا نکالا اور اس سے دیکھ کر نمبر ملانے لگا۔ اس نے اپنے دوست کو ساری صورت حال بتائی...... پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ موبائل بند کرکے بخشو سے مخاطب ہوا:

''وہ آ رہا ہے......''

''ارے...... کیا رات کے وقت بھی محکمہ کھلا ہوتا ہے۔''

''اس کا تو مجھے پتا نہیں، میں نے اسے موبائل پر فون کیا تھا...... وہ آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... اب اس کا کیا کریں...... اس کے باقی ساتھی تو بھاگ گئے ہیں...... وہ یقیناً چوہدری فضل دین کو اطلاع کریں گے۔ اگر وہ اپنے بندوں کو لے کر یہاں آ گیا تو کیا ہوگا؟'' بخشو نے کہا۔

''اللہ سب ٹھیک ہی کرے گا...... شہر سے ہمارے گاؤں کا فاصلہ ایک گھنٹے کا ہے...... ہمیں یہ گھنٹا تو نکالنا ہی ہے...... جیسے تیسے

کر کے۔'' رحمت علی نے کہا۔ وہ فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ بخشو، زلیخا اور گاما بھی یکا یک پریشان ہو گئے تھے۔ چوہدری فضل دین کا گاؤں میں بڑا رعب و دبدبا تھا۔ وہ چھوٹے زمینداروں کو بہت تنگ کرتا تھا...... وہ انہیں گمراہ کرکے، ان سے سستے داموں اجناس خرید کر شہر میں مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔

''کیا ہم گاؤں والوں کو ساری بات بتا دیں۔'' زلیخا نے اپنی بات دہرائی۔

''پورے گاؤں والوں کو نہیں، البتہ اپنے اچھے تعلقات والوں کو بتا دیتے ہیں۔''

''کچھ لوگوں کو بتانے کا مقصد، پورے گاؤں میں بات پھیلانا ہے...... ہمیں ایک گھنٹا تو نکالنا ہی ہوگا۔'' بخشو مسکرایا۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''ایسا ہی ہوگا...... ان شاء اللہ!''

''ابا جی! میرا خیال ہے، چوہدری فضل دین کے ذہن میں یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم شہر سے کسی کی مدد لیں گے، اس لیے اسے جو کرنا ہے، وہ آرام سے کرے گا...... یوں ایک گھنٹا تو گزر ہی جائے گا۔'' گامے نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ارے ہاں...... تم نے ٹھیک کہا گامے پتر...... اللہ خیر کرے گا۔''

پھر ایسا ہی ہوا، چوہدری اور اس کے بندے تو نہ آئے، شہر سے رحمت علی کا دوست اپنی کار میں وہاں پہنچ گیا۔ رحمت علی کی ہدایت کے مطابق انہوں نے اپنی کار اس کے گھر سے کافی دُور کھڑی کی تھی۔

''انسپکٹر جلال احمد! بہت شکریہ...... میں بہت پریشان ہوں۔'' رحمت علی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''پریشانی کو دُور بھگا دو...... اب میں آگیا ہوں...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''ہمیں یقین ہے۔'' بخشو اور زلیخا نے ایک ساتھ کہا تو انسپکٹر جلال احمد مسکرا دیے۔

رحمت علی اور بخشو نے ایک بار پھر اسے ساری بات تفصیل سے بتا دی...... وہ بولے: ''تم فکر نہ کرو، میں اس سے سب کچھ اگلوا کر چوہدری فضل دین کو گرفتار کرلوں گا۔'' انسپکٹر جلال احمد نے کہا۔ پھر چونک کر بولے: ''اس واقعے کو ایک گھنٹا تو ہو ہی چکا ہے...... کیا چوہدری فضل دین نے تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔''

''ابھی تک تو کوئی نہیں کی لیکن......'' رحمت علی کہہ رہا تھا کہ اسی وقت بیرونی دروازے کو زور زور سے بجایا جانے لگا۔

''وہ......وہ...... آ گئے۔'' زلیخا نے ہکلا کر کہا۔

''میں دیکھتا ہوں انہیں...... تم اس کا خیال رکھو۔'' انسپکٹر جلال احمد نے بے ہوش کمالے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

پھر وہی ہوا...... جو بُرا کرنے والوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے...... چوہدری فضل دین اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ جس وقت اُسے انسپکٹر جلال احمد لے جا رہے تھے تو گاؤں کے ایک بوڑھے کسان نے زور سے کہا:

''اس کا ظلم حد سے بڑھ گیا تھا...... اور جو چیز حد سے بڑھ جائے، اس کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے...... ہاں، بُرا ہی ہوتا ہے۔''

☆☆☆

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

اے خدا! اگر سمندر بیچ میں نہ آجاتا اور زمین ختم نہ ہو جاتی تو میں برابر فتح کے پھریرے اُڑاتا اور تیری توحید کے نعرے بلند کرتا چلا جاتا۔ یہ الفاظ جو عقبہ بن نافع نے اس وقت کہے جب وہ شمالی و مغربی افریقا کو فتح کرتا ہوا اوقیانوس کے کنارے پر جا پہنچا اور اس نے بے اختیار گھوڑا سمندر میں ڈال دیا، لیکن موجوں نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہی وہ سمندر تھا جسے پرانے زمانے میں غالباً اس لیے بحرِ ظلمات کہا جاتا تھا کہ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس سمندر کے آگے کیا ہے۔ عقبہ بن نافع اسلام کے ابتدائی دور کا نامور فاتح اور بڑا باتدبیر سپہ سالار تھا۔ شمالی افریقا میں مصر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فتح ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عربوں نے لیبیا پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس کے آگے بربر آباد تھے جن کے ساتھ سخت لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے خلافت کی باگ دوڑ سنبھالی تو عقبہ کو منتخب کیا کہ وہ بربروں کا خرخشہ مٹا دے اور اسلامی حکومت کے مغربی حصے میں امن وامان قائم کرے۔ عقبہ نے سب سے پہلے تیونس میں ایک مناسب مقام تجویز کر کے ایک چھاؤنی قائم کر دی، اسے فوجی مرکز بنا کر آگے قدم بڑھانا تھا۔ بعد میں وہاں وہ شہر آباد ہوا، جس نے قیرواں کے نام سے عالمگیر شہرت پائی۔ عقبہ نے نئے مرکز سے پیش قدمی شروع کی تو بربر کہیں مقابلہ نہ کر سکے۔ عقبہ شہروں پر شہر فتح کرتا ہوا شمالی افریقا کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ وہیں اس نے وہ الفاظ کہے تھے جن سے تاریخ کا ایوان ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ علامہ اقبالؒ نے ''شکوہ'' میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(بگڑے ہوئے کاموں کو سنوارنے والا)

اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جس کی سلطنت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوسکتی جو اس کی مراد اور چاہت کے خلاف ہو۔

اُردو میں جابر کے معنی ظالم ہی لیے جاتے ہیں، لیکن عربی میں جابر کے معنی وہی نہیں ہیں جو اُردو میں ہیں بلکہ جابر کا ایک معنی ٹوٹی ہوئی چیز کو بہت خوبی سے جوڑنے والا بھی ہے۔

بدحال شخص ہو تو اس کی حالت کو درست کرنے والا اور جو دل کسی کے ظلم سے ٹوٹ جائے تو اسے جوڑے والا۔ اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ کے معنی ظلم کرنے والا یا عذاب دینے والا کرنا ہماری غلط فہمی ہے۔

ٹوٹی ہڈی

شہروز اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سائیکل لڑکھڑاتی ہوئی پختہ سڑک پر بنے ہوئے فٹ پاتھ کے ایک کونے سے جا ٹکرائی۔ وہ بازو کے بل کونے پر گرا تو بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ سخت تکلیف سے رونے لگا۔ پڑوس کے صاحب اسے فوراً گھر لائے۔

''ہائے...... ہائے...... میں ٹوٹ گئی۔'' ٹوٹی ہڈی درد سے کراہنے لگی۔

''توڑ دیا اس شہروز نے۔'' ٹوٹی ہڈی اپنا غصہ اس پر نکال رہی تھی۔ ''اسے اس کے ابو نے کہا بھی تھا کہ سائیکل احتیاط سے چلانا، مگر چلاتے ہوئے دیکھتا دوسری طرف ہے تو ہمیں توڑے گا ہی۔'' بازو کی لمبی ہڈی درمیان سے ٹوٹ چکی تھی۔

''ہائے......! ہماری طاقت کو کم کر دیا۔ اب ہم وہ کام نہیں کر سکتیں جو ایک ہونے کی صورت میں کرتی تھیں۔''

شہروز درد سے چلا رہا تھا، اسے فوراً گاڑی میں ڈال کر قریبی اسپتال لے جایا گیا۔

ڈاکٹروں نے ایکسرے لیے تو ہڈی ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

''وہ دیکھو ایکسرے میں ہماری شکلیں بنی ہوئی ہیں۔'' ایک ہڈی نے دوسری الگ ہڈی سے کہا جو جدا تھی۔

''اب ہم کیسے ملیں گی؟'' دوسری ہڈی نے رونی صورت بنا کر بولا۔

اسپتال میں شہروز کے بازو پر پلاستر چڑھا دیا گیا۔ ''یہ دو گولیاں صبح و شام اور یہ سیرپ ایک ایک چمچ تین ٹائم دینا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ درد میں افاقہ ہو جائے گا۔''

شہروز کو چند دن کے لیے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

''ارے! اس ڈاکٹر نے صرف درد کی دوائی دی ہے۔ ہم پر کوئی لوشن اور دوائی تو لگائی نہیں جس سے ہم ایک دوسرے سے جڑ جائیں۔'' ہاتھ کی طرف والی ہڈی نے فکر مندی سے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی ہم پر اتنا بڑا پلاسٹر چڑھا دیا، دوائی کوئی لگائی نہیں لیکن اگر کوئی دوائی لگائی ہے تو کھال کاٹ کر ہڈی میں لوشن یا ایلفی لگانی پڑے گی۔'' بازو کی طرف والی ہڈی نے سوچتے ہوئے کہا۔''ارے نا بابا نا! یہ چیر پھاڑ ہو، ہم نہیں کروائیں گے۔''

شہروز اسپتال کے ہڈی وارڈ میں آیا تو وہاں پہلے ہی کئی مریض تھے۔کسی کی بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کسی کی ٹانگ، کسی کا گھٹنا تو کسی کی پسلی کی ہڈی میں فریکچر تھا۔

''ارے! یہاں تو ہر طرف ہماری ٹوٹی ہوئی بہنیں پڑی ہیں۔''

شہروز کے ساتھ والے بیڈ پر ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ درد کی دوائی کھانے سے کچھ افاقہ تھا، مگر درد پھر بھی برابر ہو رہا تھا۔

''ارے بہن! سلام، خوش آمدید۔'' نوجوان کی ہڈی نے اس ٹوٹی ہوئی ہڈی سے کہا۔

''ارے خوش آمدید کس بات کی، مصیبت میں آئی ہوں۔ اس لڑکے کی غفلت کی وجہ سے ٹوٹی ہوں۔''

ٹوٹی ہوئی ہڈی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ نہیں، تم بھی میری طرح جڑ جاؤ گی بس صبر کرو۔'' نوجوان کی ہڈی نے شہروز کی ہڈی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اب تمہارا کیا حال ہے؟'' شہروز کی ہڈی نے پوچھا۔

''الحمد للہ! اب بالکل صحیح ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مکمل طور پر جڑ گئی ہیں۔کل ہی اسپتال سے ہمیں چھٹی مل جائے گی۔''

نوجوان کی جڑی ہوئی ہڈی نے اپنا حال بتایا۔

''ہائے اللہ! اب ہمارا کیا ہوگا؟ اب ہم کیسے جڑیں گی؟؟''

دونوں ہڈیاں ایک دوسرے کی جدائی سے بے قرار تھیں۔ ہم پہلے آسانی سے کام کر لیتی تھیں، مگر ٹوٹنے سے ہمارے اتحاد کی طاقت پارہ پارہ ہوگئی۔ اب ہم سے شہروز آدھا کلو وزن نہیں اٹھا سکتا۔''

''تم گھبراؤ مت۔'' نوجوان کی ہڈی جس پر اب صرف ایک پٹی نما پلاستر چڑھا ہوا تھا، اس نے تسلی دی۔

''ارے بہن! گھبرائیں کیوں نا...... !! ڈاکٹر نے ہمیں جوڑنے کے لیے کوئی دوائی، لوشن یا کوئی ایلفی تو لگائی نہیں، بس ایک جگہ کر کے ایک موٹا کتا پلاستر چڑھا مارا ہے۔''

''ارے! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں گھبراؤ مت، دنیا میں کوئی ڈاکٹر، طبیب، دوائی اور علاج ایسا نہیں جو ہمیں جوڑ سکے۔''

''ہیں کیا مطلب...... ! ہائے اب ہمارا کیا ہو گا......؟؟''

دونوں یہ سن کر رونے لگیں۔

''ارے سنو تو سہی نا...... اصل میں تم ابھی ٹوٹی ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے میں اس تجربے سے نکل چکی ہوں۔ دنیا کے کوئی ڈاکٹر اور اعضا بند صرف ایک اندازے سے درست کر کے ہڈی کو ہڈی کے ساتھ ملا کر پٹی باندھ دیتے ہیں اور درد وغیرہ کی دوا دیتے ہیں، صرف ایک ہے جو ٹوٹی ہڈی کو ملاتا ہے۔''

''کون ہے وہ......؟'' شہروز کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ اللہ ہے جس کا ایک نام اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ یعنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والا۔ وارڈ میں دوسری ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جو اب جڑ چکی تھیں، ان سب نے اس نوجوان کی ہڈی کی تائید کی۔

''اور ہاں! اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کو جابر کہتے ہیں یعنی ہڈیوں کو بہترین طریقے سے جوڑنے والے۔ وگرنہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں اور نہ ان کے پاس کوئی ایسا لوشن، معجون، ایلفی ہے جو آپریشن کر کے ہڈی پر لگا دیں اور اس لوشن سے ہم جڑ جائیں۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ٹوٹی ہڈی کو اس صحیح جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ ہڈی جوڑنے والی ذات صرف وہی ایک ہے۔''

کچھ عرصے بعد شہروز کا پلاستر اتر گیا۔ اس کی ٹوٹی ہڈی مکمل طور پر جڑ چکی تھی اور بازو بھی بالکل صحیح تھا۔ اس کی متاثرہ ہڈی نے شہروز سے کہا: ''آئندہ خیال رکھنا اور شکر کرو اس ذات باری تعالیٰ کا جو اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُهٗ ہے اور ہر ٹوٹے دل، بدحال کے حال کو درست اور ٹوٹی ہڈی جوڑنے والا ہے۔''

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن پاک میں پیغمبروں کے نام پر کتنی سورتیں ہیں؟

i۔ چھ سورتیں ii۔ سات سورتیں iii۔ آٹھ سورتیں

2۔ انبیاء کرام نبیؑ کو کس نام سے یاد کرتے ہیں؟

i۔ عبدالوہاب ii۔ عبدالرحیم iii۔ عبدالقہار

3۔ انسانی جسم میں گندھک کس عضو میں سب سے زیادہ ہوتی ہے؟

i۔ جلد میں ii۔ بالوں میں iii۔ معدے میں

4۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ترکے میں کیا ملا تھا؟

i۔ ایک مکان ii۔ ایک باغ iii۔ ایک کنواں

5۔ قدرتی گیس کا معروف نام کیا ہے؟

i۔ اوزون گیس ii۔ لوڈ اسٹون iii۔ آرگان گیس

6۔ مشہور زمانہ خوشبو یوڈی کولون کا نام کس ملک کے شہر کولون کی نسبت سے رکھا گیا ہے؟

i۔ فرانس ii۔ جرمنی iii۔ آسٹریلیا

7۔ علامہ اقبال نے اپنی کس کتاب میں خوش حال خاں کی وصیت کو نظم کیا ہے؟

i۔ ارمغان حجاز ii۔ بال جبریل iii۔ بانگِ درا

8۔ "جوائے کپ" کس کھیل میں دیا جاتا ہے؟

i۔ پولو ii۔ گولف iii۔ جوڈو

9۔ دریائے سندھ کی دریائی مٹی کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ پوٹاش ii۔ کھادر iii۔ سلیکی

10۔ یوم خلافت کس کی قیادت میں منایا گیا؟

i۔ مولانا محمد علی جوہر ii۔ مولانا شوکت علی iii۔ علامہ اقبالؒ

جوابات علمی آزمائش جون 2013ء

1۔ بیت المعمور 2۔ تینوں میں سے کسی میں نہیں 3۔ کوئی نہیں 4۔ دینِ اسلام 5۔ حضرت فرید الدینؒ 6۔ ہڈیاں 7۔ الخوارزمی 8۔ حیدر آباد 9۔ ڈوبل 10۔ ایڈمرل آف دا فلیٹ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ مرزا استعار بیگ، حیدر آباد (150 روپے کی کتب)

☆ محمد نعیم امین، لاہور (100 روپے کی کتب)

☆ شمائلہ کنول، خانیوال (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

محمد مجیر خان، بھکر۔ عائشہ صدیق، لاہور۔ محمد منصور، فیصل آباد۔ عبداللہ نعیم، مظفر گڑھ۔ عکرمہ مجاہد، اسلام آباد۔ سیدہ زہرا، تلہ گنگ۔ اظہر طاہر، لاہور۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ ربیعہ اقبال، کراچی۔ کشف طاہر، گوجرانوالہ۔ محمد سہیل، شیخوپورہ۔ رابعہ حسن، تلہ گنگ۔ محمد عزمان، سیالکوٹ۔ ماہ نور طارق، اسلام آباد۔ حافظ محمد الیاس خان، لاہور۔ محمد اسماعیل خان، لاہور۔ مریم فاروق، راولپنڈی۔ محمد کامران، واہ کینٹ۔ محمد زبیر عبداللہ، خانقاہ ڈوگراں۔ حسان بدر، بورے والا۔ صفا رشید، کراچی۔ عبدالرحمٰن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ فضہ سکندر، سرگودھا۔ ثمرہ طارق، گوجرانوالہ۔ طہیرہ راٹھور، جھنگ۔ ایمان خلیق راجہ، واہ کینٹ۔ مظہر عباس صدیق، کبیر والا۔ محمد عثمان علی، جھنگ۔ مناہل نسیم، اسلام آباد۔ تحریم اعجاز، فیصل آباد۔ حمنہ عارف، لاہور۔ محمد اسد ملک، راولپنڈی۔ جویریہ شکیل، لاہور۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ سیف اللہ، قصور۔ اریبہ صابر، لاہور۔ فرحان اشرف، ہارون آباد۔ اُرویٰ معطر بیگ، گجرات۔ تاب زینت، جہلم۔ محمد عبداللہ گل، راولپنڈی۔ عمیمہ عروج، ملتان۔ محمد بن طارق، رحیم یار خان۔ محمد زوہیب، کراچی۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ عبدالباسط، خانیوال۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ عبدالمعید ہاشمی، لاہور۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد۔ ہما ارجمند عروج، رحیم کوٹ۔ خلیل الرحمٰن، شیخوپورہ۔ نورالھدا خان، لاہور۔ محمد عادل عمران، لاہور۔ سید ایان بخاری، دریا خان۔ محمد اسامہ وحید، ہری پور۔ طوبیٰ احمد، ڈیرہ غازی خان۔ محمد آصف جمال، لاہور۔ بالاج کمال، راولپنڈی۔ سارہ طاہر، راولپنڈی۔ عائزہ ممتاز، لاہور۔ عفیرہ، اسلام آباد۔ اقراء زاہد بٹ، سیالکوٹ۔ فاکھہ سندس بٹ، سیالکوٹ۔ حسان قدر، لاہور۔

سوال یہ ہے کہ......!

۱۔ ''اَلْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کا کیا مطلب ہے؟

۲۔ پین گوئن کی کتنی اقسام ہیں؟

۳۔ بحیرہ قلزم کا دوسرا نام کیا ہے؟

۴۔ ایک اونس مشروم میں کتنی کیلوریز انرجی ہوتی ہے؟

۵۔ مدحت کے کیا معنی ہیں؟

۶۔ کون سا مہینہ لوگوں کے ساتھ غم خواری کرنے کا مہینہ ہے؟

درج بالا سوالوں کے جوابات جون 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجیے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

جون 2013ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

1- احمد بلال خان، چکوال

2- انعم، ہنگو

3- شمائلہ فضل کریم، راولپنڈی

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 / جولائی 2013ء ہے۔

نام ______ مقام ______

میں عہد کرتا / کرتی ہوں کہ ______

موبائل نمبر: ______

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 / جولائی 2013ء ہے۔

سوال یہ ہے کہ......!

نام ______ عمر ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 / جولائی 2013ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ______

مقام: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

جولائی کا موضوع ''مٹھائی کی دکان'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 / جولائی 2013ء ہے۔

ہونہار مصور

نام ______ عمر ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ______ شہر ______

مقاصد ______

موبائل نمبر: ______

1- ایک رہ پر دو بہنیں جائیں
سر پر بھاری بوجھ اٹھائیں

2- بکھرے بال کمر ہے پتلی
ہو گی کسی کونے میں لیٹی

3- تن کی لمبی سر کی چھوٹی
کر دے سب کی بوٹی بوٹی

4- اک شے جب بھی ہاتھ میں آئے
پانی پی پی گھلتی جائے

5- فٹ بھر ہے اس کی لمبائی
کل دنیا اس میں سمائی

6- ایک ڈبے میں میٹھے دانے
جب کھولا تو پڑے چبانے

7- بیٹی جا پہنچے بازار
بابا گھر کا چوکی دار

8- بند آنکھوں نے جو دکھلایا
کھولی آنکھ تو غائب پایا

9- منہ کھولا کیا شکل بنائی
شکر کیا جب بھی وہ آئی

10- پانی پی پی پھول رہی ہے
پیٹھ پہ جھولا جھول رہی ہے

بندر میاں کب اپنی شرارتوں سے باز آتے ہیں۔ اس بار بھی شرارت شرارت میں اپنا پتنگ الجھا بیٹھے۔ اب سلجھا نہیں رہے، کتنی معصومیت سے آپ سے مدد کی درخواست کر رہے ہیں۔

نصیب

محمد فاروق دانش

حلوائی جلیبیاں تیار کرنے میں مصروف تھا اور معراج اسے دیکھنے میں ۔ وہ جلیبیوں کے ایک ایک گھماؤ کو غور سے اپنی آنکھوں میں یوں جذب کر رہا تھا جیسے وہ جلیبیاں بنانا سیکھ جائے گا۔ اس نے پندرہ سال کا ہونے کے باوجود منوں کے حساب سے جلیبیاں کھا رکھی تھیں لیکن انھیں خریدتے وقت بنتا ہوا اتنی توجہ سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج ......آج اس کے پاس صرف توجہ تھی لیکن جلیبی خریدنے کے لیے پیسے نہ تھے۔

''اے لڑکے! جلیبی کھاؤ گے کیا؟''

وہ ایک دم خیالات کی دنیا سے نکل آیا۔

''نن.... نہیں....'' اسے کسی سے ایسے سوال کی توقع نہ تھی، اس لیے وہ گھبرا سا گیا۔

''دل کر رہا ہے تو لے جاؤ، افطاری میں اچھی لگتی ہیں۔'' اجنبی نیک دل تھا، وہ اس کے دل کی آواز کو بھانپ گیا تھا۔

''ارے بھائی! اس بچے کو بھی دس روپے کی جلیبیاں دے دینا۔'' اس نے سو کا نوٹ دیتے ہوئے مٹھائی پیک کرنے والے سے کہا۔ وہ نہیں نہیں کرتا رہا لیکن وہ نوجوان دس روپے کی جلیبی کا لفافہ اسے بھی پکڑا کر چلتا بنا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان جلیبیوں کا کیا کرے؟ وہ روزے سے تھا اور اس کا دل بھی کر رہا تھا لیکن رقم نہ تھی۔ اب یہ صاحب اسے دس روپے کا مال دلا گئے تھے۔ وہ اسے کیا سمجھے، احسان یا پھر بھیک.... مگر میں نے تو اس سے نہیں مانگی تھی جلیبی..... وہ تو خود دلا کر گیا ہے۔ اس نے اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کی۔ ''مجھے یہ جلیبیاں گھر لے ہی جانی چاہئیں۔ گھر میں افطاری کے لیے نہ جانے کچھ ہوگا بھی یا نہیں۔'' یہ سوچ کر اس نے لفافے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

☆

''ابو ابو! میری بات سنیں!''

''ہاں بولو بیٹا جی!''

''ایک درجن سموسوں کے ساتھ کم ازکم دو کلو جلیبیاں بھی لینی ہیں افطاری کے لیے۔'' اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''بغیر جلیبیوں کے افطاری میں مزا نہیں آتا۔''

''ہاں بیٹا جی! فکر کیوں کرتے ہو، کہو تو پانچ کلو لا دوں تمھیں؟'' اس کے ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔ ابا نے اسے دو کلو جلیبیاں دلا دیں۔

''اے لڑکے! ایک طرف ہو جاؤ۔'' سائیکل والے نے گھنٹی بجائی تو وہ خیالات کی دنیا سے باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اب دو کلو نہیں، دس روپے کی جلیبیاں تھیں ۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں کہ وقت ایک سا نہیں رہتا۔

''یار معراج! برف کا ایک کٹورا تو دے دو میرے دوست۔ ہمارے گھر کا فریج کام نہیں کر رہا۔'' اس کے دوست ارسلان نے آ کر اس سے استدعا کی تو اس نے اسے بُری طرح جھاڑ دیا۔

''ابے یار! تم تو بالکل ہی بھوکے ہو، برف کے لیے بھی بار بار چلے آتے ہو۔'' اس کے انداز میں تکبر نمایاں تھا۔ ''ہمارے اپنے اتنے شربت بنتے ہیں کہ برف کم پڑ جاتی ہے، اوپر سے تم جیسے منگتے چلے آتے ہیں۔''

''بھائی! نہیں دیتے تو نہ دو لیکن مجھے منگتا نہ کہو۔ ہمارے گھر میں بھی فریج ہے۔'' ارسلان کو اس کا طعنہ بے حد بُرا لگا تھا۔ ''آج نہیں تو کل وہ درست ہو جائے گا۔ اگر تمھیں کبھی ضرورت پڑے تو بے تکلف چلے آنا۔''

"ضرورت پڑے تو.....ہونہہ!" اس نے بُرا سا منہ بنایا اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔

ان کا افطاری کا دستر خوان قابل دید ہوتا تھا۔ کیا خوب قسم قسم کی کھجوریں، عمدہ پھل، کچوری، پکوڑے، سموسے اور بہت کچھ۔ وہ، اس کے والد، والدہ، دو بہنیں اور ایک بھائی سب روزہ رکھتے تھے اور افطار پیٹ بھر کر کرتے تھے۔ آج بھی وہ روزہ افطار کرنے کے لیے بیٹھے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

"بی بی! روزہ دار ہوں، افطاری کے واسطے کچھ بھیج دو۔"

"امی باہر کوئی بابا آیا ہے۔" ننھی رقیہ نے ماں سے فقیر کا سوال دہرایا تو اس نے جھڑک دیا۔

"ارے چلتا کرو ننھی! ایک کو دیں گے تو چار اور جمع ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی تو افطاری ہمارے لیے ہی کم پڑ جاتی ہے۔"

اس کی ماں کا انداز بھی تقریباً وہی تھا جو معراج کا تھا۔

"امی! دے ہی دیتیں کچھ نہ کچھ بابا کو۔" رقیہ کو اس روزہ دار فقیر پر ترس آ رہا تھا۔

"مجھے پڑھانے کی کوشش مت کرو، اور خاموشی سے دستر خوان پر چل کر بیٹھو۔" وہ اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

......☆......

حاجی قمر، شہر کے مشہور علاقے ملت کالونی میں اپنی دکان حاجی بک اسٹال کے سامنے کھڑے اس کی وحشت کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ یہ وہ دکان تھی جو انھوں نے پچیس سال سے زائد عرصے تک بڑی کامیابی سے چلائی تھی۔ ان کا یہ بک اسٹال شہر کے نام ور بک اسٹالوں میں سے تھا۔ پاکستان بھر میں چھپنے والے تمام چھوٹے بڑے اخبارات وجرائد کا ان کی دکان میں نہ ملنا ناممکن تھا۔ کوئی نیا شمارہ یا پرانا اخبار ان کی دکان سے بآسانی مل جاتا تھا۔ پورے شہر میں ان کے اسٹال کا چرچا تھا۔ لوگ جہاں بسوں اور سوزوکیوں کے انتظار میں ان کے اسٹال پر کھڑے ہو کر اخبارات کی سرخیاں پڑھ لیتے تھے، وہیں سیکڑوں لوگ ان کے خریدار بھی تھے۔ اسٹال پر روزانہ دس، بارہ ہزار کی سیل تو معمولی سی بات تھی۔ اس کے ابو بتایا کرتے تھے کہ اس کام میں برکت بہت ہے۔ پوری سیل کا تیسرا حصہ منافع ہوتا ہے منافع۔ اگر بارہ ہزار کی سیل ہوتی تھی تو چار ہزار روپے انکم ہوتی تھی گویا ان کی ہر طرح سے چاندی ہی چاندی تھی۔

بہترین کھانا اور مہنگا ترین پہننا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ وہ قدرت کی نعمتوں کو بے دردی سے استعمال کرتے، جو کھا لیا سو کھا لیا جو بچ گیا، وہ پھینک دیا۔ پرانا یا باسی کھانا ان کے شعار میں نہ تھا۔ حاجی قمر صاحب پھر بھی دردمند انسان تھے۔ وہ دوپہر کے وقت اسٹال پر ہوٹل سے کھانا اور بازار سے پھل منگاتے تھے تو اپنے ورکروں کو بھی بھرپور طریقے سے کھلاتے تھے۔ رمضان میں بھی جب افطاری وہاں کرتے تو دیگر دکان داروں کو بھی بلا کر اس میں شریک کرتے۔ وہ اپنی بیگم کو بارہا سمجھاتے تھے کہ جب کھانا زیادہ ہو تو اڑوس پڑوس میں بھی بھجوادیا کرو، خوامخواہ ضائع مت کیا کرو لیکن وہ ان کی بات ایک کان سے سنتیں اور دوسرے سے نکال دیتیں۔

وہ بے چارے دل مسوس کر رہ جاتے۔ اسی طرح فدا، معراج اور صبا کو بھی تکبر نے گھیر لیا تھا۔ دوستوں کو اپنے نئے کپڑے، نئی گھڑیاں، جوتے اور دیگر آرائشی سامان دکھا کر اپنی امارت کا رعب جمانے کا شوق بڑھ چلا تھا۔ ایک ننھی رقیہ اپنے باپ کی طرح سادہ اور نرم دل تھی لیکن اس کی سنتا کون تھا۔ وہ کوئی بات کر کے اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی تھی۔

حاجی بک اسٹال سستے دنوں کی یادگار تھا۔ شہر میں کوئی بھیڑ بھاڑ نہ تھی، کوئی جھگڑا، کوئی رش، کوئی بے روزگاری نہ تھی۔ ہر طرف امن وچین اور خوش حالی تھی۔ وہ اپنا اسٹال گاڑی کھاتے کے ایک فٹ پاتھ پر کھل کے لگاتے تھے۔ ان کی کارنر کی جگہ تھی، تین میٹر ادھر تو تین میٹر دوسری جانب ان کی دکان سجتی تھی۔ آنے جانے والوں کو دُور سے ہی اخبار کی مہک آجاتی تھی۔ ان کے تین ورکر دو گھنٹے میں تو صرف اخبارات ورسائل جما پاتے تھے۔ پھر ان کی نوک پلک اور درستی کا عمل سارا دن جاری رہتا تھا۔

اگلے دس سالوں میں جب امن چین کا خاتمہ ہوا اور بے روزگاری کے مسائل نے جنم لیا تو حاجی صاحب کے لیے بھی مسائل پیدا ہونا شروع ہوئے۔ فٹ پاتھ پر پہلے صرف اخبار والوں کو دھڑلے سے کام کرنے کی اجازت ہوتی تھی لیکن اب تو بھانت بھانت کے لوگ ارد گرد جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ کوئی دہی بھلے والا تو کوئی گھڑی والا تو کوئی ٹوپی والا۔ وہ جب اریب قریب آتے گئے اور سیاسی لوگ دیدے گھماتے گئے تو پھر ان کو آہستہ آہستہ اپنا گھیراؤ کم کرنا پڑ گیا۔

دائیں بائیں دوسری دکانوں کے بورڈز اور پردوں نے ان کی دکان کو چھپانا شروع کر دیا۔ ایک طرف نیوز چینلوں نے ویسے ہی اخبارات کی مارکیٹ کم کر دی تھی، دوسری طرف اب بلدیہ والے آئے دن تجاوزات ہٹانے کے چکر میں بھی ان سے خرچہ پانی لے

جاتے تھے اور کبھی مال۔ پہلے ان کو ہدایات تھیں کہ اخبارات والوں کو نہ چھیڑا جائے، بعد میں یہ استثنا جاتا رہا۔ آئے دن کی اکھاڑ پچھاڑ نے حاجی صاحب کو بلڈ پریشر اور شوگر کا مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ احتیاط کے طور پر انھوں نے اسٹال کے سامنے والے ہوٹل میں ایک کیبن کرایہ پر لے لیا تھا جہاں وہ رات کو اپنا سامان بند کر جاتے تھے، اب جب کہ تجاوزات والے بار بار سامان لے جانے لگے تو ان کو محدود ہو کر اسٹال کو کیبن میں لے جانا پڑا۔ وہ بار بار بلدیہ والوں سے لڑ بھڑ کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ان کے نصیب کی جو روزی ہے، وہ انھیں مل کر رہنی ہے۔

ہوٹل والا بھی کایاں شخص تھا، اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پہلے تو کیبن انھوں نے صرف مال رکھنے کی خاطر لیا تھا لیکن اب تو وہ دکان بھی اس میں لگاتے ہیں تو اس نے ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور ہر سال کرایہ میں اضافہ کی تکرار کرنے لگا تھا۔ دس سال پہلے جو کیبن انھوں نے پانچ سو روپے کرایہ پر لیا تھا، اب وہ دس ہزار روپے پر آ چکا تھا۔ سیل کم ہوتی جا رہی تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔

ان دنوں ہوٹل کے مالک نے جب انھیں کرایہ پندرہ ہزار روپے کرنے کا نوٹس دیا تو انھوں نے ایک ماہ کی مہلت مانگی اور اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ وہ پرانے اور نئے جرائد اونے پونے فروخت کرنے لگے۔ انھوں نے اب اس کام سے فراغت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج جب انھوں نے پچیس برس کی اپنی دولت کو واپس کیا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی۔ وہ دُور کھڑے اپنے بند اسٹال پر نظریں گاڑے گہری سوچ میں مگن تھے۔

”کیا حسین دور تھا، کس کس طرح یہاں پڑھنے والوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ کس طرح لوگ ان کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ کیسے کیسے ادیب اور مفکر ان کے اسٹال کی حاضری لگایا کرتے تھے اور ان سے پُرتپاک انداز میں ملا کرتے تھے۔

انھوں نے رومال سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور گھر کی جانب چل دیے۔ ایک سال میں انھوں نے دو چار نئے کام شروع کرنے کی کوشش کی لیکن کام یابی کے بجائے نقصان ہوتا چلا گیا۔ بچا کر رکھنے کی ان کے گھر والوں میں عادت نہیں تھی اور جو کچھ انھوں نے اپنے پاس بچا کر رکھا تھا وہ سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ ایک ایک وقت میں جہاں چار چار کھانے پکتے تھے، آج اس گھر میں افطاری خریدنے کے لیے پیسے بھی نہ تھے۔

”ارے یہ تم کدھر سے لے آئے؟“

اس کی والدہ نے جب اس کے ہاتھ میں جلیبیاں دیکھیں تو بول اٹھیں۔

”میرے دوست نے دلائی ہیں۔“ اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ اس کی امی نے وہ اٹھا کر دسترخوان پر رکھ دیں۔ مختلف انواع واقسام کے کھانوں سے بھرا رہنے والا دسترخوان اس وقت صرف دس روپوں کی جلیبی پر محیط تھا۔

”چلو! آج اسی پر رب کا شکر ادا کریں گے۔“ حاجی صاحب نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا۔

افطاری میں کوئی پندرہ منٹ کا وقت تھا اس لیے وہ اٹھ کر وضو کرنے چلے گئے۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ معراج دوڑ کر گیا۔ دروازے پر کوئی مہمان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس اور ایک بڑا سا شاپر تھا۔

معراج نے ابو کو بتایا تو وہ وضو کر کے دروازے پر پہنچے۔

”جی...“ انھوں نے نہ پہچانتے ہوئے کہا۔

”میں نصیب ہوں، نصیب اللہ!“ اس نے انھیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ ”آج سے کوئی سولہ سترہ سال قبل میں آپ کے اسٹال پر کام کرتا تھا۔“

وہ سوچنے لگے۔ بیماریوں اور پریشانیوں نے ان کی یادداشت ختم کر کے رکھ دی تھی۔ ابھی تک انھیں کچھ یاد نہیں آیا تھا۔

”میں آج ہی فیصل آباد آیا تھا۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میں پہلے اسٹال گیا، اسے بند پایا تو تشویش ہوئی اس لیے سیدھا گھر چلا آیا۔“ وہ خود ہی وضاحت کر رہا تھا۔

افطاری کا وقت بالکل قریب تھا اس لیے انھوں نے اسے اندر بلانے میں دیر نہیں کی۔

”یہ کیا؟“ اس نے جب سامنے صرف جلیبیاں رکھی دیکھیں تو اس کے منہ سے تف نکل گیا۔ ”آپ کی افطاری تو بازار بھر میں مشہور تھی۔“ آنے والے اجنبی کو سب کچھ یاد تھا۔

”وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ انھوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آنٹی جی! آپ کو زحمت تو ہوگی۔“ اس نے اپنا شاپر ان کی بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہی خیال تھا کہ شاید آپ نہ ملیں تو....

میں نے بازار سے خریداری کر لی تھی۔"

ان کی بیگم نے سامان نکالا تو ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس میں ویسا ہی کچھ کھانے پینے کا سامان تھا جیسا وہ پچھلے سال تک اپنے خوان پر سجاتے تھے۔ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی دوسروں کی لائی ہوئی افطاری سے انھیں اپنا روزہ کھولنا پڑے گا۔

جب نماز سے فراغت ہوئی تو حاجی صاحب نے سوال کیا۔

"ہاں برخوردار! اب اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں نے تمھیں اب تک نہیں پہچانا۔"

"بہت پہلے جب میں آپ کے اسٹال پر لگا تھا تو میں نرا ان پڑھ تھا۔" نصیب بتا رہا تھا۔ "مجھے اخبار کے نام تک پڑھنا نہیں آتے تھے، آپ وفاق مانگتے تو میں روزنامہ سورج اٹھا کر دیتا۔ مجھے اس بات پر آپ مارتے بھی تھے کہ میں پڑھتا کیوں نہیں ہوں۔"

وہ بتا رہا تھا اور وہ سوچوں کے گہرے سمندر میں غرق تھے۔

"ایک روز جب میں نے آپ کو یہ بتایا کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں اور میں اپنے سوتیلے ماموں کے ہاں دکھ سکھ کی زندگی کاٹ رہا ہوں تو آپ مجھے خود اسکول داخل کرانے لے گئے تھے۔"

"ہاں ہاں....." انھیں اب کچھ کچھ یاد آ رہا تھا۔ "مگر اس کے بعد سے تمھارا کچھ پتا نہ چل سکا۔"

"جی.....وہی تو میری زندگی کی اصل ٹریجڈی ہے۔" اس کے چہرے پر رنج کے سائے لہرانے لگے۔ "آپ نے داخلہ کرا کے مجھے پانچ سو روپے کورس کی خریداری کے لیے دے دیے تھے۔ پھر.... میرا دراصل پڑھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔میں نے رقم ملنے پر موقع غنیمت جانا اور لاہور بھاگنے کی ٹھان لی۔"

"اچھا..." وہ حیرانی سے بولے۔معراج کے لیے بھی اس کہانی میں دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"میں بس سے فرار ہو ہی چکا تھا کہ مجھے دو اغوا کاروں نے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ کر لیا۔ بس میرے نصیب اچھے تھے کہ ان کے اڈے تک پہنچنے سے قبل میں بھاگ نکلا۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ "یہی وہ لمحہ تھا جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ اصل میں پڑھنے لکھنے میں ہی زندگی ہے۔ مجھے بے حد صدمہ تھا کہ میں آپ کی ہدایت کے مطابق اسکول میں کیوں نہ پڑھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" معراج نے سوال کیا۔

"میں نے اپنے طور پر ایک اسکول میں داخلہ لیا۔ ایک ہم درد گھرانے نے مجھے ملازمت اور سر چھپانے کو جگہ دے دی۔ بس زندگی یوں ہی کٹتی چلی گئی۔"

"پھر آپ نے کتنا پڑھا؟"

"میں نے پنجاب یونی ورسٹی سے فرسٹ کلاس میں ایم بی اے کر لیا۔" اب اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ "اب میں ایک نجی ادارے میں پراجیکٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔"

"اوہ شاباش! اللہ تمھیں ڈھیروں کامیابیاں عطا فرمائے!" حاجی صاحب نے اسے دعا دی۔

"اس ادارے کے تحت ہم تعلیم عام کرنے کے لیے ہر شہر میں ایک قندیل اسکول شروع کر رہے ہیں۔میں فیصل آباد اسی سلسلے میں آیا تھا تو سوچا سب سے پہلے اپنے محسن کی قدم بوسی کروں۔"

"محسن کیسا؟" حاجی صاحب نے انکساری سے کہا۔

"اگر آپ نے مجھے اسکول میں داخل نہ کرایا ہوتا یا وہ پانچ سو روپے مجھے نہ ملے ہوتے تو شاید آج وہ کچھ نہ ہوتا جو اب ہوں۔" اس نے نہایت سادگی سے کہا۔

وہ سوچ رہے تھے کہ دنیا میں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو بڑے مرتبے پر پہنچنے کے بعد کسی کو یاد رکھتے ہوں۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔

"ہاں! اب آپ تو بتایئے کہ آپ کا اسٹال بند کیوں کر ہوا؟ اور یہ غربت؟"

اپنی تمام کہانی نماز تراویح کے بعد انھوں نے اس کے سامنے رکھ دی۔

"چلیں! اللہ نے آپ کی اور میری مشکل آسان کر دی۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میرے اسکول میں ایک صاف ستھرا کینٹین اور بک شاپ بھی ہوگا جس کی ذمہ داری کسی نہ کسی اہل فرد کو سونپنا ہے۔تو اس شہر کے اسکول کا یہ اسٹال میں آپ کو سونپتا ہوں۔ آپ کے اسٹال جتنی تو نہیں لیکن برکت والی روزی ہوگی جو یقیناً آپ کو فروغ علم سے مربوط بھی رکھے گی اور مجھے زندگی کے اس موڑ پر اپنے محسن کے احسان کا بدلہ چکانے کا موقع مل جائے گا۔"

نصیب اللہ کی گفت گو سن کر معراج کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ ایک وہ تھا کہ جو باپ کے مال پر اتراتا پھر رہا تھا اور ایک یہ ہے کہ قابل انسان بن کر بھی تکبر سے پاک ہے۔

☆☆☆
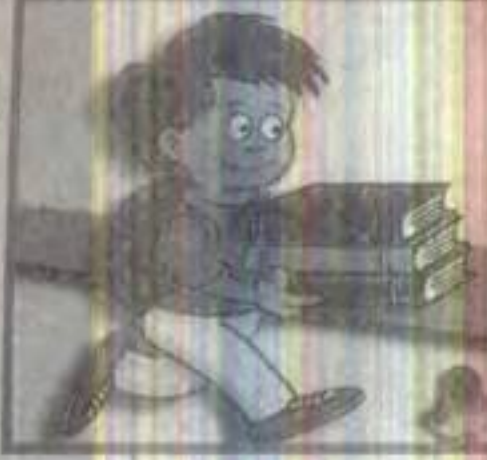
مثالِ دُنیا

مولانا روم سے کسی نے دُنیا کی حقیقت پوچھی تو آپ نے فرمایا: دُنیا کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص جنگل میں چلا جاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ میرے پیچھے شیر آ رہا ہے۔ وہ بھاگا، جب تھک گیا تو دیکھا کہ آگے گڑھا ہے۔ چاہا کہ گڑھے میں گر کر جان بچائے لیکن گڑھے میں ایک اژدھا نظر آیا۔ اب شیر کا ڈر تھا۔ اتنے میں ایک درخت کی ٹہنی پر نظر پڑی۔ وہ اسے پکڑ کر درخت پر چڑھ گیا مگر درخت پر چڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ درخت کی جڑ کو دو سفید اور سیاہ چوہے کاٹ رہے ہیں۔ بہت خوف زدہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں درخت کی جڑ کٹ جائے گی اور نیچے گر پڑوں گا اور پھر شیر اور اژدھا کا لقمہ بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ اتفاقاً اس کی نظر شہد کے ایک چھتے پر پڑی، وہ شہد کو پینے میں اتنا مشغول ہوگیا کہ نہ شیر کا ڈر رہا، نہ اژدھے کا خوف اور نہ چوہوں کا غم۔ اتنے میں درخت کی جڑ کٹ گئی اور وہ گر پڑا۔ شیر نے چیر پھاڑ کر گڑھے میں گرا دیا اور وہ اژدھے کے منہ میں جا پہنچا۔

یہاں جنگل سے مراد دُنیا ہے اور شیر موت ہے جو پیچھے لگی ہے۔ گڑھا قبر ہے جو اس کے آگے ہے اور اژدھا وہ بُرے اعمال ہیں جو قبر میں ڈسیں گے۔ چوہے دن رات ہیں۔ درخت عمر ہے اور شہد کا چھتا دُنیائے فانی کی غافل کر دینے والی لذت ہے کہ انسان دُنیا کی فکر میں موت اور اعمال بد کی جواب دہی وغیرہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر اچانک موت آجاتی ہے۔

(دعا اعظم، شیخوپورہ)

سرخ جامہ

پرانے زمانے کی بات ہے کہ ملک تاجکستان پر ایک نیک اور خدا ترس بادشاہ عادل حکومت کرتا تھا۔ وہ نہایت انصاف پسند بادشاہ تھا اور رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ ملک میں امن و امان اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ ایک دن اتفاقاً وہ بہرہ ہوگیا۔ اس نے تمام ارکان دولت کو جمع کیا اور اپنی اس بے بسی پر رو دیا۔ اس کا حال دیکھ کر وہاں موجود تمام حاضرین بھی رونے لگے اور علاج کی تدبیریں سوچنے لگے۔ سبھوں نے اسے مشورہ دیا کہ آپ نہ صرف ملک میں موجود حکیموں سے بلکہ پڑوسی ملک کے حکیموں کو بلا کر اپنا علاج کروائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت یابی عطا کرے گا۔ بادشاہ نے کہا: میں اپنے بہرے ہونے پر نہیں روتا ہوں بلکہ غم تو یہ ہے کہ مظلوم کی فریاد کیسے سنوں گا اور ان کی داد رسی کیسے کر سکوں گا۔ لہٰذا اس معاملے میں، مَیں نے سوچا کہ یہ اعلان کرا دوں کہ کوئی مظلوم کے سوا سرخ جامہ نہ پہنے۔

بادشاہ نے ملک بھر میں منادی کرا دی کہ آج سے مظلوم سوائے جامہ سرخ کے دوسرا لباس نہ پہنے اور یوں اس نیک دل بادشاہ نے ان مظلومین کی داد رسی کے لیے آسان حل ڈھونڈ نکالا۔

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

تین دوستوں کی کہانی

علم، دولت اور عزت تینوں گہرے دوست تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ تینوں کو جدا ہونا پڑا۔ تینوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ وہ کہاں جائیں گے؟

علم بولا: میں مدرسہ اور اسکول جاؤں گا۔

دولت نے کہا: میں محل اور امیروں کے پاس جاؤں گی۔

عزت خاموش رہی۔ دونوں نے وجہ پوچھی تو عزت بولی: میں ایک بار چلی گئی تو واپس نہیں آؤں گی۔

(کشف طاہر، لاہور)

مہکتی کلیاں

☆ دیوار کا پتھر خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اپنی اہمیت رکھتا ہے۔

☆ ہر دانا، مخلص اور اچھا آدمی گفتگو کم اور عمل زیادہ کرتا ہے۔

☆ وقت تمام زخموں کا مرہم ہے۔
☆ ماضی سے سمجھوتہ کرلیں تو آپ کا حال خوش گوار ہوگا۔
☆ زندگی کی قدر آخری سانس لینے والے سے پوچھو۔
☆ اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے، اتنا ہی زیادہ عطا کرتا ہے۔

(انصر علی، وہاڑی)

اقوالِ زریں

☆ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلہ نہیں لیتا۔
☆ تین چیزیں انسان کو برباد کرتی ہیں۔ جھوٹ، غیبت، ناشکری۔
☆ ہمیشہ سچ بولو تاکہ قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔
☆ جھوٹ بولنے سے چہرے کی معصومیت ختم ہو جاتی ہے۔
☆ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔
☆ کام شروع کرنا تمہارا کام ہے، ختم کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

(حمنہ افتخار، اسلام آباد)

روشن کرنیں

☆ غریب وہ ہے جس کے پاس نیکی نہیں۔
☆ انسان کی پہچان دوست سے ہوتی ہے۔
☆ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔
☆ سب سے آسان کام کم بولنا ہے جس کا نفع بہت زیادہ ہے۔
☆ خوش رہنا اچھی عادت ہے لیکن دوسروں کی خوشی میں خوش رہنا بہترین عادت ہے۔
☆ بے عمل، عالم پارس پتھر کی طرح ہے جو دوسروں کو تو سونا بناتا ہے لیکن پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے۔
☆ جب انسان اللہ سے دُور ہو جائے تو سکون سے دُور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ خوف و اندیشہ آ جاتا ہے۔

(ایمل سہیل جوسس، ایبٹ آباد)

سنہرے موتی

☆ تمہارے ساتھ کوئی بدی کرے تو تم نیکی کرو کیوں کہ اندھیرے کو اجالے سے ہی دُور کیا جا سکتا ہے۔
☆ علم وہ چاند ہے جس کی کرنوں سے نور برس کر دلوں میں اترتا ہے۔
☆ علم کا درخت ہمیشہ شادابی کے پھلوں سے لدا رہتا ہے جس کی شاخیں اور کونپلیں سدا تروتازہ رہتی ہیں۔
☆ اپنے منہ سے اپنی تعریف کروانا، دوسروں سے بھیک مانگنے کے مترادف ہے۔
☆ کامیابی ان کو ملتی ہے جو ہمیشہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔
☆ نیک دل انسان دشمنوں سے نیکی کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔
☆ اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا نہ ہو۔
☆ بُرے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔

(صائمہ رجب، تاندلیانوالہ)

دس چیزیں

☆ توبہ گناہ کو کھا جاتی ہے۔
☆ غیبت نیک اعمال کو کھا جاتی ہے۔
☆ غم عمر کو کھا جاتا ہے۔
☆ صدقہ بلاؤں کو کھا جاتا ہے۔
☆ پشیمانی سخاوت کو کھا جاتی ہے۔
☆ نیکی بدی کو کھا جاتی ہے۔
☆ جھوٹ رزق کو کھا جاتا ہے۔
☆ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔
☆ تکبر علم کو کھا جاتا ہے۔
☆ عدل ظلم کو کھا جاتا ہے۔

(سمیرا فرید احمد، حیدر آباد)

قطرہ قطرہ شبنم

☆ بُرے لوگوں کی ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے۔
☆ عدل و انصاف ہر چیز سے خوب ہے۔
☆ شکر گزار مومن عافیت سے قریب ہے۔
☆ موت سے محبت کرو تو زندگی عطا کی جائے گی۔
☆ طمع کا ترک فقر ہے اور لوگوں سے نا امیدی غنا ہے۔
☆ سچائی کو مضبوطی سے پکڑ لو اگرچہ سچائی تمہیں قتل کر دے۔
☆ سلامتی گمنامی میں ہے یا خلوت میں۔

(حمیرا صفدر سیال مرالی (پیراں غائب))

پین گوئن ..... پرندہ برف میں زندہ

رانا محمد شاہد

ایک مشہور انگریز شکاری جم کاربٹ نے شیر کے متعلق کہا تھا کہ یہ ''جنٹل مین آف جنگل''، یعنی جنگل کا ''مردِ مہذب'' ہے جب کہ پرندوں میں پین گوئن کو قطبِ جنوبی کا ''مہذب طائر'' کہا جاتا ہے۔ اپنی سج دھج اور خوب صورتی کی بنا پر پین گوئن دُور سے آتا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی انگریز ڈنر سوٹ پہن کر دعوت میں آرہا ہو۔

آبی پرندوں میں پین گوئن کو ایک مختلف، نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ زمین کا جنوبی کرہ ان کا مسکن ہے۔ ان کی 17 مختلف اقسام ہیں۔ پین گوئن صرف نام کا ہی پرندہ ہے، یہ اُڑ نہیں سکتا۔ اس کے پروں کی جگہ ہاتھ ہوتے ہیں جو اسے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ پین گوئن زیادہ تر سمندر کے کنارے رہتے ہیں۔ البتہ بچے دینے کے لیے خشکی کا رخ بھی کرتے ہیں۔ خشکی پر یہ مختلف گھونسلے بنا کر اپنے انڈے سیتے ہیں۔ پین گوئن...... ایک ایسا آبی پرندہ ہے جو سال میں چھ مہینے سمندر میں رہتا ہے۔ پین گوئن زبردست تیراک ہے۔ وہ اپنی گردن، پیروں اور بازوؤں کی مدد سے اتنی تیزی سے آگے بڑھتا ہے کہ ایک گھنٹے میں پندرہ میل کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔

پین گوئن ایک بہترین غوطہ خور بھی ہے۔ یہ سمندر میں ایک ہزار فٹ گہرائی تک جا سکتا ہے اور آب دوز کی طرح پانی کے اندر ہی اندر تیر بھی سکتا ہے۔ سانس لینے کے لیے وہ اپنے مضبوط بازوؤں کے ذریعے پانی سے باہر نکلتا ہے اور اسی رفتار سے دوبارہ پانی میں چلا جاتا ہے۔

پانی کے دوسرے پرندوں کی نسبت ان کی عمریں لمبی ہوتی ہیں۔ زرد آنکھوں والے پین گوئن کی عمر 20 سال سے زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم انسان کی پھیلائی آلودگی اور ماحولیاتی تبدیلی اس کی صحت اور زندگی کے لیے خطرناک ہو چکی ہے۔ اس سے ان کی نسل ختم ہونے کا اندیشہ بڑھ گیا ہے۔ پین گوئن غول کی صورت میں اکٹھے رہتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے آخری کناروں پر بھی ان کی ایک قسم بیان کی جاتی ہے جنھیں جے کس پین گوئن کہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں خاصی کمی آرہی ہے۔ ہر گزرتے سال کے ساتھ ان کی آبادی 20 فیصد گھٹ رہی ہے۔

1983ء میں تیل لے کر جانے والے دو سمندری جہاز ڈوب جانے اور ان سے رسنے والا تیل جے کس پین گوئن کے لیے موت کا پیغام لے کر آیا۔ اس تیل میں ڈوبنے سے لاکھوں پین گوئن ہلاک ہو گئے۔ ماحولیات کے ماہرین نے اس پرندے کی نسل کو ختم ہوتے دیکھا تو ہزاروں کی تعداد میں پین گوئن پکڑ کر انھیں محفوظ مقام پر لے گئے۔ ان کے پروں کی صفائی کی، انھیں علاج اور غذا فراہم کی اور جب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تو انھیں ان کے ٹھکانوں پر لے جا کر آزاد کر دیا۔

پین گوئن کا اصل وطن انٹارکٹیکا ہے۔ انٹارکٹیکا ایک برفیلا علاقہ

ہے۔ وہاں پر برف ہی برف ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہاں زندگی گزارنا بہت مشکل ہے لیکن قدرت نے پین گوئن کو ان مشکل حالات میں جینے کا ہنر سکھا دیا ہے۔ جس طرح پین گوئن سانس لینے کے لیے پانی سے باہر چھلانگ لگاتا ہے اسی طرح پانی سے برف پر آنے کے لیے بھی ایک لمبی جمپ لگاتا ہے۔ یہاں بھی طاقتور بازو اس کی مدد کرتے ہیں اور وہ کسی راکٹ کی طرح برف پر آن اترتا ہے۔

پانی کی نسبت پین گوئن زمین پر سست چلتا ہے لیکن ایسا پہلی بار ہوتا ہے جب وہ دوڑنا شروع کر دے تو اچھا خاصا بھاگ سکتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ بھیڑوں کے گلوں میں سینکڑوں بچے ہوتے ہیں اور ان سب کی شکل وصورت ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہمارے لیے ان بچوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے لیکن مائیں فوراً اپنے بچوں کو پہچان لیتی ہیں۔ کیسے......؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بچے کی ایک خاص بو ہوتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بھیڑ اسے سونگھتی ہے۔ اس کی بو کو یاد رکھتی ہے اور پھر اسی بو کے ذریعے اپنے بچے کی پہچان کرتی ہے۔

پین گوئن بھی فوراً اپنے بچوں کو پہچان لیتی ہے۔ جب پین گوئن مائیں سمندر میں مچھلیوں کی تلاش میں نکلتی ہیں تو اپنے بچوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ سب بچے ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی مائیں واپس آتی ہیں اور بھوکے بچوں کے ہجوم میں سے گزرتی ہیں تو وہ صرف اپنے بچوں کو ہی خوراک دیتی ہیں، کسی دوسرے کے بچے کو نہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق پین گوئن آواز اور شکل وصورت سے اپنے بچے کو پہچان لیتی ہے۔

انٹارکٹیکا کے برفانی علاقوں میں پائے جانے والے اس خوب صورت پرندے کے بارے میں ایک انتہائی عجیب اور دلچسپ بات مشہور ہے۔ یہ عجیب بات شاید آپ نے پہلے کہیں نہ پڑھی ہو۔

ایک پین گوئن باپ مسلسل ساٹھ دن یا اس سے بھی زیادہ ایک ہی جگہ پر انٹارکٹیکا کی برفیلی ہواؤں اور سردی کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اس دوران نہ وہ کچھ کھاتا پیتا ہے اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلتا ہے۔ ہے نا حیرانی کی بات کہ آخر وہ اتنی مشقت کیوں اٹھاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب پین گوئن ماں انڈے دیتی ہے تو اس

کے فوری بعد پین گوئن باپ ان انڈوں کے پاس آ جاتا ہے اور انہیں ڈھانپ لیتا ہے تاکہ انڈوں کو حدت پہنچے اور ان میں سے بچے نکل آئیں۔ مسلسل 60 سے زیادہ دن بھوکا پیاسا رہنے سے پین گوئن باپ کا وزن بیس سے پچیس پاؤنڈ تک کم ہو جاتا ہے۔ جب ان انڈوں سے ننھے ننھے بے بی پین گوئن نکل آتے ہیں تو ان کے باپ اپنے گلے میں جمع شدہ ایک خاص قسم کی مائع غذا نکالتے ہیں اور اس سے بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ اس کے بعد پین گوئن ماں ان بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آ جاتی ہے اور یوں اتنے لمبے عرصے کے بعد پین گوئن باپ کو چھٹی ملتی ہے۔

کیوں! ہے نا حیرت انگیز بات...... کس طرح دنیا کا یہ خوب صورت اور معصوم باپ پرندہ ایک عظیم ترین خدمت انجام دیتا ہے۔

آپ کے لیے یہ بات حیرانگی کا باعث ہو گی کہ پین گوئن جو بحرِ منجمد جنوبی اور ایسے ہی سرد علاقوں میں پایا جاتا ہے، دُنیا کا واحد آبی پرندہ ہے جس کی جنس کو آج تک دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ خود پین گوئن بھی ایک دوسرے کی جنس آسانی سے شناخت نہیں کر پاتے۔ یہ پرندے عموماً فصلوں کے موسم میں کثیر تعداد میں اکٹھے ہو کر علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ پین گوئن سمندر میں 30 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تیر سکتے ہیں، خشکی پر ہوں تو سیدھے کھڑے ہو کر چلتے ہیں۔ یہ بہت سیدھے سادے اور جلد مانوس ہو جانے والے پرندے ہیں۔

اُستاد: اس نقشے میں پانی کہاں ہے؟
شاگرد: اس میں پانی نہیں ہے۔
اُستاد: وہ کیسے؟
شاگرد: اس میں پانی ہوتا تو یہ گیلا ہوتا۔ (سرمد عزیز، تربیلا)

ایک دفعہ ملا نصرالدین اپنے بیٹے کے ساتھ جنگل میں گھوم رہے تھے کہ راستہ بھول گئے۔ شام ہونے کے بعد بھی راستہ نہ ملا تو ملا جی نے بیٹے سے کہا: میری خیر ہے میں کسی بھی وقت پہنچ جاؤں گا، مگر تم ابھی ہی چلے جاؤ، ماں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔
(سرمد شمریز، راولا کوٹ)

اُستاد (شاہد سے): بتاؤ دُنیا کی سب سے بھاری چیز کون سی ہے
شاہد: جناب آپ کا دایاں ہاتھ۔ (عبدالمومن ادریسی، علی پور)

اُستاد: بتاؤ دولت اور محنت میں کیا فرق ہے؟
شاگرد: جب ابو کسی کو قرض دیتے ہیں، وہ دولت اور اسے واپس لینے کے لیے جو دھکے کھاتے ہیں، وہ محنت ہے۔ (احمد شہزاد، جہلم)

ایک کنجوس ڈاکٹر اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ تم بھی میری طرح بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا۔
بیٹا: وہ کیوں؟
کنجوس ڈاکٹر: تاکہ میرا سفید والا کوٹ تمہارے کام آسکے۔
(محمد عمار صدیق، کراچی)

ایک لڑکا اپنے دوست کے گھر گیا۔ اس کے دوست نے اسے چائے پلائی۔ لڑکے نے کہا: چائے تو بڑی مزے دار ہے۔
دوست نے کہا: اگر بلی دودھ سے ملائی نہ کھا جاتی تو اور بھی مزے دار بنتی۔ (فائزہ شہزاد، لاہور)

ایک آدمی جنگل سے گزر رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک شیر آگیا۔
شیر: آج میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔
آدمی: میرا خون تو ٹھنڈا ہے، پیچھے سے ایک نوجوان آرہا ہے اس کا خون گرم ہے۔
شیر: نہیں، آج میرا کولڈ ڈرنک پینے کو دل چاہ رہا ہے۔
(جویریہ شکیل، لاہور)

دو بیوقوف ایک گائے کو سیڑھیوں سے اوپر لے جا رہے تھے۔
ایک شخص نے پوچھا: اسے اوپر کیوں لے جا رہے ہو؟
ایک بیوقوف نے کہا: اسے ذبح کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔
اس شخص نے کہا: یہیں ذبح کر لو۔
دوسرے بیوقوف نے کہا: چھری تو اوپر رکھی ہے۔
(محمد حذیفہ انوار، جھنگ)

بیگم (شوہر سے): جلدی اٹھیے، چور میرا کمبل لے گئے ہیں۔
شوہر (سوتے میں): بیگم فکر مت کرو، جب وہ تکیہ لینے آئے گا تو میں ان کو پکڑ لوں گا۔ (سعد علی، سرگودھا)

امیدوار گھر گھر جا کر ووٹ مانگ رہے تھے۔ ایک امیدوار نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی تو ایک بچہ باہر آیا۔ امیدوار نے اس سے پوچھا: بیٹا، تمہارے ابو قومی اتحاد میں ہیں یا سیاسی جماعت میں ہیں؟
بچے نے معصومیت سے جواب دیا: جی، میرے ابو باتھ روم میں ہیں۔ (قمر ناز دہلوی، کراچی)

ایک شخص (بھکاری سے): تمہیں شرم نہیں آتی، رات کو بھی بھیک مانگ رہے ہو۔
بھکاری: مہنگائی کا زمانہ ہے جناب! رات دن ایک کرنا پڑتا ہے۔
(انصر علی، وہاڑی)

ایک پروفیسر صاحب بال کٹوانے کے لیے بیٹھے۔ حجام نے پوچھا: جناب! بال کیسے کاٹوں؟
پروفیسر صاحب: بالکل خاموشی سے۔
(حمزہ سعید، حنظلہ سعید، حمنہ حور، فیصل آباد)

مریض (ڈاکٹر سے): ڈاکٹر صاحب! یہ دوائی تو کہیں سے بھی نہیں مل رہی.....؟
ڈاکٹر: اوہو! دوائی لکھنا تو میں بھول ہی گیا، یہ تو میرے دستخط ہیں۔
(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

میری زندگی کے مقاصد

اوّاب الرحمان، اسلام آباد
میں پائلٹ بنوں گا اور دنیا کے کونے کونے کی سیر کروں گا۔

سبحان فرید، لاہور
میں پڑھ لکھ کر اچھا انسان بنوں گا اور ماں باپ کی خدمت کروں گا۔

رانا محمد احمد افضل، گوجرانوالہ
میں ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد فرحان، بہاول پور
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

نجیب اللہ، ملتان
میں سائنس دان بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔

محمد یاسر، کراچی
میں بڑا ہو کر اپنے والدین کی خدمت کروں گا اور ان کا سہارا بنوں گا۔

محمد ہارون شاہ، خان پور
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد شادمان، لاہور
میں پڑھ لکھ کر والدین اور ملک وقوم کا نام روشن کروں گا۔

محمد ارسلان کارلو، نور پور تھل
میں ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

فرحین انور، احمد پور شرقیہ
میں لیکچرار بن کر ملک وقوم کی خدمت کروں گی۔

سحر عامر، لاہور
میں ماہر معاشیات بن کر پاکستان کے معاشی مسائل حل کرنے میں مدد کروں گی۔

محمد حسان، لاہور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

زین احمد شفقت، لاہور
میں ایک اچھا پاکستانی شہری اور افسر بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

ندا ارشد ملک، راول پنڈی
میں پاک فوج میں جا کر پاکستان کی حفاظت کروں گی۔

تحریم فاطمہ، واہ کینٹ
میں ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی اور والدین کا نام روشن کروں گی۔

عاقب رفیع، جہلم
میں فوجی بن کر ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

محمد حسن قاسم، لاہور
میں بڑا ہو کر قانون دان بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

نور العین، کوہاٹ
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

موسیٰ شہباز، گوجرانوالہ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

ولید فرحان، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر سیاست دان بنوں گا اور ملک کی تقدیر بدل دوں گا۔

عبدالمجید، مانسہرہ
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

حماد آصف، سرگودھا
میں فوجی بن کر ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

سحر کومل، اٹک
میں پریس رپورٹر بنوں گی اور ہمیشہ سچ کا ساتھ دوں گی۔

محمد احسن مقصود، حویلی لکھا
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

محمد مسعود الحسن، مردان
میں بڑا ہو کر حافظ قرآن اور باعمل عالم بنوں گا۔

چاکلیٹ

دُنیا بھر کے بچے اور بڑے ہلکا تلخ لیکن ذائقے دار چاکلیٹ (Chocolate) کا مزا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب دودھ، آئس کریم، بسکٹ، چائے اور کھانسی کے سیرپ وغیرہ بھی اس ذائقے

میں دستیاب ہیں۔ چاکلیٹ امریکہ کے درخت، CACAO کے بیجوں (Seed) سے حاصل ہوتا ہے۔ اس درخت کا سائنسی نام "THEOBROMA COCAO" ہے۔ یہ بیج ذائقے میں کڑوے ہوتے ہیں لیکن ان کی فرمنٹیشن (Fermentation) کی جاتی ہے تاکہ یہ خوش ذائقہ ہو جائیں۔ انسان 1100 قبل مسیح سے اس درخت کے بیجوں سے مشروب بنا کر پیتا رہا ہے کیوں کہ اس میں الکلائیڈز پائے جاتے ہیں جو دماغ کو تروتازہ رکھتے ہیں۔ ان کیمیائی مادوں میں سے ایک THEOBROMINE بھی ہے جس کی بُو کتے اور بلی کو پسند نہیں۔ اس لیے یہ دونوں جانور چاکلیٹ کھانا پسند نہیں کرتے۔ چاکلیٹ کو خوش ذائقہ بنانے کے لیے اس میں دودھ، مکھن اور چینی کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ 19 ویں صدی میں برطانوی نژاد "John Cadbury" نے چاکلیٹ کی ٹھوس (Solid) شکل تیار کرنے کا طریقہ متعارف کروایا۔ یوں چاکلیٹ کی ٹکیاں، گولیاں، ٹافیاں بنانا بھی ممکن ہو گیا۔ چاکلیٹ کا ذریعہ COCAO TREE 15 سے 26 فٹ بلند ہوتا ہے۔ یہ امریکہ سے تعلق رکھنے والا سدا بہار پودا ہے۔ چاکلیٹ کے بیج پھلی میں ہوتے ہیں جنہیں COCAO POD کہتے ہیں۔ ان کی لمبائی 15 سے 30 سینٹی میٹر جب کہ چوڑائی 8 سے 10 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ پھلیاں پیلی یا نارنجی رنگ کی ہوتی ہیں۔ چاکلیٹ نمی اور درجۂ حرارت کے لیے حساس ہے۔ چاکلیٹ کو 15 سے 17 سینٹی گریڈ ٹمپریچر پر رکھنا چاہیے۔ چاکلیٹ پر دُنیا بھر میں ڈرامے، فلمیں اور کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

کھمبی

کھمبی یا MUSHROOM اکثر برسات میں اُگتی ہے۔ یہ نرم و نازک سپورز (spores) پیدا کرنے والی فنجائی ہے۔ کھمبیوں کو سانپ کی چھتری، جن کی نسوار، سانپ کے انڈے وغیرہ کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے۔ کھمبی چھتری نما ہوتی ہے جس کے نیچے گلز (Gills) پائے جاتے ہیں جن پہ سپورز بنتے ہیں۔ کھمبیوں کی کئی اقسام زہریلی ہیں جنہیں کھا کر انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تاہم مشرومز کھائی بھی جاتی ہیں۔ یہ Low Calory غذا ہیں۔ مشرومز وٹامن B خاص

کر رائبوفلیون، نیاسن، چکنائیوں، کاربوہائیڈریٹس، کیلشیم، سلینئم، کاپر، فاسفورس اور پروٹین کا خزانہ ہیں۔ مشرومز میں وٹامن C نہیں پائی جاتی۔ البتہ مشرومز پر الٹرا وائلٹ شعاعیں پڑیں تو یہ وٹامن D بناتی ہیں۔ ایک اونس مشروم کھانے سے 20 کیلوری انرجی حاصل ہوتی ہے۔ دُنیا میں چین، امریکہ، ہالینڈ، فرانس اور پولینڈ کھمبی اُگانے والے ٹاپ 5 ممالک ہیں۔ کھمبیاں ادویات اور رنگوں کی تیاری میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مشروم کو اچھی غذا قرار دیا ہے۔ تاہم کھمبیاں ماہرین کی اجازت کے بغیر نہیں کھانی چاہئیں۔

یوریا

یوریا (Urea) کو CARBAMIDE بھی کہتے ہیں۔ اس نامیاتی مرکب کا فارمولا $Co(NH_2)_2$ ہے۔ جانداروں میں کیمیائی تعاملات کے نتیجہ میں یوریا پیدا ہوتا ہے جسے ہمارے گردے خون سے الگ کر کے پیشاب میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کیمیائی تعاملات کو یوریا

سائیکل کہا جاتا ہے۔ یوریا کے بارے میں ہالینڈ کے ماہر ہرمن بوہریو (HERMAN BOERHAEVE) نے پہلی مرتبہ 1727ء میں یوریا کے بارے میں بتایا۔ بعد ازاں 1828ء میں معلوم ہوا کہ یوریا کو غیر نامیاتی مرکبات سے بھی بنایا جا سکتا ہے۔ یوریا سفید ٹھوس شکل میں حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کی کثافت $1.32 g/cm^3$ جب کہ اس کا نقطۂ پگھلاؤ 133 سے 135 سینٹی گریڈ ہے۔ دُنیا میں سب سے زیادہ یوریا کھاد استعمال ہوتی ہے کیوں کہ یہ نائٹروجن کا ذریعہ ہے۔

تاہم جانداروں میں اس کی زیادتی نقصان دہ ہے کیوں کہ یہ زہریلے اثرات رکھتا ہے۔ یوریا کو بطور Raw Material پلاسٹک، چکنے والے مادوں اور پوٹاشیم سائینائیڈ (زہر) کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یوریا دھماکہ خیز مواد، یوریا نائٹریٹ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یوریا صنعتی اور سائنسی تجربہ گاہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

سائیکلنگ

سائیکلنگ (Cycling) یعنی بائیسکل چلانا ایک اہم کھیل ہے جو اولمپکس میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ دُنیا کے ایک ارب انسان سائیکل چلاتے ہیں۔ 14 اپریل 1900ء کو یونین آف سائیکلسٹ انٹرنیشنل کا قیام عمل میں آیا جس کا صدر دفتر اب

سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ سائیکل ریس پہلی مرتبہ 31 مئی 1868ء کو پیرس میں منعقد ہوئی جو 1200 میٹر پر محیط تھی۔ اس ریس کا فاتح "James Moore" تھا۔ اس کی سائیکل آج بھی برطانیہ کے عجائب گھر میں رکھی ہے۔ دُنیا بھر میں اب سڑک، میدان، ٹریک، پہاڑی راستوں وغیرہ پر ریس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اب تک دُنیا کی طویل ترین ریس امریکہ میں منعقد ہوئی ہے جو ایک دن میں 206 میل (332 کلومیٹر) پر محیط تھی۔ دُنیا کی پہلی سائیکل ریس چیمپئن شپ شکاگو میں 1893ء میں منعقد ہوئی جو ٹریک پر ہوئی۔ پاکستان سائیکل فیڈریشن کا قیام 1974ء میں کراچی میں عمل میں آیا۔ ٹور ڈی پاکستان (Tour de Pakistan) سائیکل ریس باقاعدگی سے کراچی سے پشاور تک (1648 کلومیٹر) گیارہ مراحل میں مکمل کی جاتی ہے۔ دُنیا میں سب سے زیادہ سائیکلنگ چین میں ہوتی ہے۔

اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

زبیدہ سلطانہ

ضرب المثل کہانی

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا

منصور نے پہلی بار کسی آدمی کو ایک بہت اونچے کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے دیکھا۔ وہ سیر کے لیے بڑے بھائی کے ساتھ ایک ایسے باغ میں آیا تھا جہاں کھجور کے درخت بھی تھے۔ اس نے حیران ہوکر بھائی سے پوچھا:

''بھیا! اتنے اونچے درخت پر بھلا یہ آدمی کیسے چڑھا ہوگا؟''

بھائی کے جواب دینے سے پہلے ہی قریب کھڑے ایک آدمی نے مذاق سے ہنستے ہوئے کہا:

''بیٹا! یہ آدمی درخت پر چڑھا نہیں، بلکہ آسمان سے گرا ہے اور کھجور کے درخت میں اٹک گیا ہے۔''

یہ سن کر منصور پریشان ہوگیا اور کہنے لگا:

''اوہو! اب اس کا کیا ہوگا؟ یہ تو اس بے چارے کے لیے دوہری مصیبت ہوگئی کہ ایک تو یہ آسمان سے گرا اور اب اتنے اونچے کھجور کے درخت میں اٹکا ہوا ہے اور پھر کوئی بھی اس غریب کی مدد نہیں کر رہا۔''

منصور مارے ہمدردی کے رونے کے قریب ہو رہا تھا۔ قریب کھڑے لوگ بچے کے بھولے پن پر ہنسنے لگے تو وہ اور بھی حیران ہوکر بولا:

''بھیا! کوئی اس کی مدد کیوں نہیں کرتا؟ الٹا سب ہنس رہے ہیں!''

''یہی لوگ جو ہنس رہے ہیں اسے اتار لیں گے، تم فکر نہ کرو، آؤ گھر چلیں۔''

بھائی نے ہنس کر کہا اور منصور کی انگلی پکڑ کر روانہ ہوگیا۔ منصور نے گھر آ کر امی کو بھی کھجور پر اٹکے ہوئے آدمی کا حالِ زار سنایا، جسے اس نے دوہری مصیبت میں گرفتار دیکھا تھا۔

جو شخص ایسی کیفیت میں ہو کہ ایک مشکل سے نکل نہ پائے اور دوسری میں پھنس جائے تو کہتے ہیں کہ اس کی تو وہی مثال ہے کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔

علی اکمل تصور

مسیحا

میجر ڈاکٹر طارق حسین کے کلینک پر لوگوں کا زبردست ہجوم تھا۔ اللہ نے ان پر اپنی خاص عنایت کر رکھی تھی۔ جس مریض کو کہیں سے شفا نہیں ملتی تھی، وہ یہاں آ کر صحت یاب ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے روز بروز ان کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ان کا تعلق فوج سے تھا، اسی وجہ سے ان کے ہر کام میں زبردست نظم و ضبط نظر آتا تھا۔ آنے والے مریض ان کے لیے آمدنی کا ذریعہ نہیں تھے۔ وہ تو بس سب کے دکھ درد دُور کرنا چاہتے تھے۔

وہ انسانیت پر مہربان تھے شاید اسی وجہ سے اللہ ان پر مہربان تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کسی نئے آنے والے مریض کے منتظر تھے۔ پہلے مریض کو چیک اپ کے بعد انہوں نے دوا تجویز کر دی تھی۔ وہ انہیں دعائیں دیتا رخصت ہو گیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا، ڈاکٹر طارق نے دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ بزرگ ایک نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھے چلا آ رہا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے اس بزرگ کا دم پھولا ہوا تھا جب کہ اس نوجوان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے۔ ڈاکٹر طارق ان دونوں کی ظاہری حالت دیکھ کر سلگ کر رہ گیا۔ اس بزرگ نے بوسیدہ سے کپڑے پہن رکھے تھے جب کہ وہ نوجوان شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی اور چہرے پر خوشی والی چمک تھی۔ وہ بزرگ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ چہرے پر دکھوں کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب...... میں......'' اس نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''خاموش رہو......'' ڈاکٹر طارق نے اسے جھڑک دیا۔ ان کے مزاج میں تلخی تھی اور تلخی کا ایک سبب بھی تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ نوجوان کتنا بدبخت ہے کہ جس نے اپنے بزرگ کا خیال نہیں رکھا۔ وہ بزرگ اس کا دادا ہو سکتا تھا، اس کا باپ ہو سکتا تھا۔ جو بھی رشتہ ہو لیکن یہ نوجوان اپنے بزرگ کو کس حال میں ان کے پاس لے کر آیا ہے۔ والدین ساری زندگی اپنے بچوں کے ناز اٹھاتے ہیں اور جب وہ ضعیف ہو جاتے ہیں، کمزور ہو جاتے ہیں، تب بچے جو بڑے ہو چکے ہوتے ہیں، خود مختار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کی پروا نہیں کرتے۔ ان کے سامنے بھی شاید ایک ایسا ہی

نوجوان کھڑا تھا جس نے اپنے باپ کی پروا نہیں کی تھی اور اب جب وہ باپ زندگی اور موت کی سرحد پر کھڑا تھا تو وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے آیا تھا۔ وہ نوجوان میجر ڈاکٹر طارق حسین کی نظروں سے گر چکا تھا اور اب ڈاکٹر صاحب اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہمدردی کا مرکز صرف اور صرف وہ بزرگ مریض تھا۔ انہوں نے اس بزرگ کو مریضوں والے بیڈ پر لٹا دیا اور پھر پوچھا۔

''آپ کو کیا تکلیف ہے......''

''کیا بتاؤں بیٹا...... کل صبح منہ اندھیرے میں نیند سے جاگا تو کھانسی کے بعد میرے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میرا بیٹا مجھے ایک سرکاری اسپتال میں لے گیا۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے سیرپ کی دو شیشیاں مجھے پینے کے لیے دیں لیکن سارا دن گزر گیا مجھے آرام نہیں آیا اور......'' بزرگ کی بات ابھی جاری تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور پھر پورے انہماک سے اس کا چیک اپ کرنے لگے۔ بلڈ پریشر دیکھا، دل کی رفتار کو نوٹ کیا۔ ٹارچ کی روشنی میں گلے کا جائزہ لیا۔

''ڈاکٹر صاحب...... وہ...... میں......'' اس نوجوان نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی۔

تم خاموش رہو اور یہ کچھ ٹیسٹ لکھ کر دے رہا ہوں کلینک میں موجود لیب سے نتیجہ لے کر آؤ اور سنو! تمہیں کچھ پروا ہے کہ تمہارے باپ کی حالت کیسی ہے۔ انہیں فوراً سے پہلے طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اس لیے جلدی کرو......'' ڈاکٹر صاحب کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ اس نوجوان کا سر جھک گیا۔

''جی بہتر......'' وہ نوجوان اس بزرگ کو لیے کمرے سے باہر نکلا اور کاؤنٹر پر آ کر رک گیا۔ یہاں ایک خاتون بیٹھی تھی۔ پرچی دیکھ کر اس نے کہا۔

''آپ آٹھ سو روپیہ جمع کروا دیجیے......''

''جی بہتر......'' نوجوان نے اپنی جیب میں سے پرس نکالا اور مطلوبہ رقم اس خاتون کے حوالے کر دی۔ اگلے آدھے گھنٹے میں اس بزرگ کے تمام ٹیسٹ مکمل ہو چکے تھے اور اب وہ دونوں دوبارہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نظر کا چشمہ لگائے بغور ان رپوٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے۔ ''آپ کے والد صاحب کے دل کی چار شریانوں میں سے تین شریانیں بند ہیں اور منہ سے جو خون کا اخراج ہوا ہے، وہ پھیپھڑوں میں ورم آنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں کچھ ضروری انجکشن لکھ کر دے رہا ہوں۔ وہ آپ فارمیسی سے لے کر آئیے۔ وہ انجکشن میں خود نہیں لگاؤں گا......'' ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ یہ نوجوان اپنے باپ کے علاج میں سستی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس لیے ابتدائی طبی امداد کے حوالے سے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''جی بہتر......'' اس نوجوان نے فوراً ہی ڈاکٹر صاحب کا حکم مان لیا تھا۔ اس بزرگ کو انتظار گاہ میں بٹھانے کے بعد وہ دوا لینے نکل گیا۔ ریلوے روڈ پر ادویات کی خرید وفروخت کی دکانیں تھیں۔ میجر ڈاکٹر طارق حسین کے کلینک سے ان دکانوں کا فاصلہ تقریباً دو کلومیٹر تھا۔ اس کے پاس موٹر بائیک موجود تھی۔ اب وہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اگلے تین منٹ میں وہ شہر کی سب سے بڑی فارمیسی کے سامنے کھڑا تھا اور پھر اسے ایک صدمے نے گھیر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کے تجویز کردہ انجکشنوں میں جو انجکشن سب سے اہم تھا، وہ سٹاک میں موجود نہیں تھا اور نہ ہی کہیں سے ملنے کی امید تھی۔ اب وہ نوجوان اسی رفتار کے ساتھ واپس لوٹا۔

''ڈاکٹر صاحب یہ انجکشن نہیں ملا۔ آپ اس کا کوئی متبادل تجویز کر دیجیے......'' اس کی بات پر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور اس انجکشن کا نام کاٹ کر ایک نیا نام لکھ دیا۔ اس کے کمرے میں سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جیسے خود سے بات کی ہو۔

''اولاد نالائقی کا مظاہرہ نہ کرے تو دونوں تکلیف سے بچ جائیں۔ والدین بھی اور اولاد بھی......''

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ نوجوان دوبارہ کلینک میں داخل ہوا۔ وہ تمام مطلوبہ ادویات لے آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ یہ ادویات پینتیس سو روپے سے زیادہ مالیت کی ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کا شک تھوڑا کم ہوا تھا کہ یہ نوجوان اپنے باپ کی ادویات پر روپے خرچ نہیں کرے گا۔

اس بزرگ کی خون والی نس میں بنولہ لگا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب

نے خود اس بزرگ کو وقفے وقفے سے تین انجکشن لگائے تھے۔
"گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی....."
"نہیں..... اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں....." ڈاکٹر صاحب کو اس بزرگ کے چہرے پر پہلی بار سکون کے تاثرات نظر آئے تھے۔
"اچھی بات ہے....." پھر ڈاکٹر صاحب انہیں اپنے ساتھ لیے کمرے میں آ گئے۔
"یہ چار دن کی دوائی ہے۔ چکنائی سے پرہیز کرنا ہے اور پانچویں دن دوبارہ آنا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مکمل صحت یاب ہو جائیں گے....." ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔
"اللہ آپ کو سلامت رکھے....." اس بزرگ نے ڈاکٹر صاحب کو دُعا دی۔
"اب آپ جا سکتے ہیں....." وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں سے باہر نکلتے، ڈاکٹر صاحب نے اس نوجوان کو آواز دی۔
"سنو بیٹا..... بزرگوں کی شفقت اور سایہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ دولت سے بھی زیادہ..... ان کا خیال رکھنا بھی عبادت ہے۔"
"جی مجھے احساس ہے۔ میں اس عبادت میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اب یہ میرے ساتھ رہیں گے۔" اس نوجوان نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیا مطلب..... کیا یہ پہلے تمہارے ساتھ نہیں رہتے تھے....." ڈاکٹر صاحب چونکے۔
"جی نہیں..... پہلے یہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ اب یہ میرے ساتھ رہیں گے....."
"میں سمجھا نہیں....." ڈاکٹر صاحب کے لہجے میں الجھن تھی۔
"میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا لیکن آپ میری بات سننے کو ہی تیار نہیں تھے۔ میں نے جب بھی بات کرنے کی کوشش کی، آپ نے مجھے خاموش کرا دیا۔ اگر اب آپ سننا چاہیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میں ایک سرکاری بینک میں ملازمت کرتا ہوں۔ آج صبح اپنی بائیک پر بینک کی طرف جا رہا تھا تو میں نے ان بڑے میاں کو دیکھا۔ یہ ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھے خون تھوک رہے تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میں آگے نہ جا سکا۔ ان پر جب اس مرض نے حملہ کیا تو ان کے سگے بیٹے نے اس ڈر سے انہیں گھر سے نکال دیا کہ کہیں اس کے بچے بیمار نہ ہو جائیں۔ اس نے جنت کو گنوا دیا اور میں..... میں تو جنت کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں....." اس نوجوان کی آواز رندھ گئی۔ آنسوؤں کی برسات اُمڈ کر اس کی آنکھوں میں آئی تھی لیکن اس نے کمال حوصلے سے اس سیلاب پر بند باندھ لیا تھا۔
"یہ میرا باپ نہیں ہے..... اور میں اس کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے اس میں وہ جنت نظر آ رہی ہے جو اللہ پاک نے اپنے مومن بندوں کو دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور آپ....." اس نوجوان نے بزرگ کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتا، ڈاکٹر صاحب نے اسے آواز دی۔
"بیٹا! اپنی بات تو مکمل کر کے جاؤ....." اس نوجوان کا سر جھک گیا اور وہ بہت نرمی سے بولا۔
"گستاخی معاف..... آپ ڈاکٹر تو بہت اچھے ہیں لیکن انسان شناس نہیں ہیں۔ بس یہی کہنا تھا....."
"درست کہا تم نے..... اب میں بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں....." ڈاکٹر صاحب بولے۔
"کیا اس جنت میں میرا بھی کوئی مقام ہو سکتا ہے....." انہوں نے آٹھ سو روپے کی رقم اس نوجوان کی طرف بڑھا دی۔ یہ وہ رقم تھی جو ڈاکٹر صاحب نے اس بزرگ کے میڈیکل ٹیسٹ کرنے کی مد میں اس نوجوان سے وصول کی تھی۔
"کیوں نہیں ضرور....." آنسو اس نوجوان کی آنکھوں سے چھلک پڑے تھے۔ یہ وہ نوجوان تھا جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ ایک نالائق بیٹا ہے لیکن وہ تو ایک مسیحا تھا جس نے مریض کے ساتھ ساتھ معالج کا بھی علاج کر دیا تھا۔ پھر وہ نوجوان اس بزرگ کا ہاتھ پکڑے کمرے میں سے باہر نکل گیا لیکن اپنے ایثار کی روشنی سے اس نے ڈاکٹر صاحب کے پورے وجود کو منور کر دیا تھا۔

آئیے عہد کریں!

فیضان چوتھی جماعت کا طالب علم ہے اور اپنی دادی جان سے ابو جی کی شکایت کر رہا ہے۔ اس نے آج چھٹی کا سارا دن بوریت سے گزارا۔ وہ صبح دیر سے اٹھا۔ امی نے جب اسے ناشتے کے لیے بلایا تو اس کی طبیعت اچاٹ سی پائی تھی۔ اسکول کا ہوم ورک اور پڑھائی بھی نہ کی اور سارا دن اپنی طبیعت کو تھکا ہوا اور بوجھل پایا۔ ٹی وی دیکھنے بیٹھا تو اٹھنے کا نام نہ لے رہا تھا۔

فیضان، دادی اماں سے یہ شکایت کر رہا تھا کہ ابو جی نے اسے صبح سویرے اٹھنے کے لیے کہا ہے۔ انھوں نے صبح اٹھ کر دانت صاف کرنے، وضو کر کے نماز پڑھنے اور اپنے دیگر معمولات کو بھی جن میں پڑھائی اور کھیل شامل ہیں، وقت پر ادا کرنے کو کہا۔ فیضان کو ابو جی کے صبح سویرے اٹھنے کی بات بہت بُری لگی اور وہ سارا دن ہر بات پر بہت ضد کرتا رہا۔

دادی جان نے فیضان کو اپنے پاس بلایا اور اسے پیار سے مثالیں دے کر سمجھایا۔ دادی جان نے کہا کہ بیٹا صبح سویرے اٹھنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ انسانی صحت پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ معمولاتِ زندگی اچھے طریقے سے انجام پاتے ہیں۔ پرندے صبح سویرے نہار منہ گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس اپنے گھونسلوں میں آتے ہیں۔ صبح سویرے اٹھنے سے ہر کام میں خیر و برکت ہوتی ہے، جب کہ دیر سے اٹھنے پر نحوست چھائی رہتی ہے۔ فیضان کو دادی اماں کی بات بہت پسند آئی اور اس نے عہد کیا کہ میں بخوشی اب ابو جی کا کہنا مانوں گا۔

بچو! آپ بھی عہد کریں کہ آپ والدین کا کہنا مانیں گے اور صبح سویرے اٹھ کر اپنے معمولاتِ زندگی مروجہ طریقے سے انجام دیں گے۔ جو بچے یہ عہد کریں گے ان کے نام آئندہ شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔

شاباش پچھلے شمارے میں ان بچوں نے عہد کیا ہے کہ وہ جانوروں اور پرندوں کو تنگ نہیں کریں گے۔

ثناء اللہ خلیل، واہ کینٹ۔ محمد سہیل علی، شیخوپورہ۔ محمد آصف جمال، لاہور۔ ولید احمد، لبیب احمد، ڈی جی خان۔ یوسف جمیل لغاری، میرپور آزاد کشمیر۔ اسامہ ظفر، سرائے عالم گیر۔ محمد اسامہ وحید، ہری پور۔ امیر حیدر، تونسہ شریف۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد۔ صفا رشید، کراچی۔ محمد عبداللہ گل، راول پنڈی۔ شہزاد حیدر شیخ، لاہور۔ محمد زوہیب، کراچی۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ محمد طیب طوفانی، سرائے نورنگ۔ ماہ نور ارشد ایبٹ آباد۔ فرحان الٰہی بٹ، فہد زاہد بٹ، سیال کوٹ۔ عمارہ یوسف، راولپنڈی۔ ملیحہ رحمٰن رانا، کلور کوٹ۔ ہما ارجمند عروج، رحیم کوٹ۔ آمنہ کمال، راول پنڈی۔ عبداللہ بن نعیم، مظفر گڑھ۔ لاریب قیصر، چکوال۔ زنیرہ شکیل، علی پور چٹھہ۔ سلیمان علی، واہ کینٹ۔ محمد عثمان علی، جھنگ صدر۔ اریج ظل، راول پنڈی۔ جنید عمر، دریا خان۔ عروج ندیم، مردان۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ مظہر عباس صدیقی، کبیر والا۔ صباحت تنویر، پشاور۔ دانیا نثار احمد، لاہور۔ حافظہ نمرہ، فیصل آباد۔ حفصہ فرقان، لاہور۔ عبدالحنان فیصل آباد۔ عائشہ صدیقی، لاہور۔ جوریہ شکیل، لاہور۔ مسکان شہزاد، راول پنڈی۔ حافظ محمد عادل نوید، کمالیہ۔ محمد ابرار علیم، سیال کوٹ۔ افراص احمد، اجنالہ۔

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

بیگم سلمٰی روزانہ صبح سویرے اپنے شوہر کے ساتھ سیر کو جاتی ہیں۔ حسبِ معمول آج بھی صبح جب وہ سیر کو نکلیں تو انھوں نے دیکھا کہ نہر کنارے لوگوں کا کافی رَش لگا ہوا ہے۔ انھیں اس بات پر تشویش ہوئی اور معاملہ کو جاننے کی کوشش کی۔ جب انھوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو کسی نوجوان کی لاش اوندھے منہ پانی میں تیر رہی تھی۔ لوگ مختلف چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ نوجوان پانی میں ڈوب کر مرا ہے، جب کہ دوسرے افراد کہہ رہے تھے کہ اس نوجوان پر کسی نے تشدد کر کے اپنا جرم چھپانے کے لیے نہر میں پھینکا ہے۔ اس لیے یہ نوجوان کی طبعی موت نہیں ہے بلکہ یہ حادثاتی موت واقع ہوئی ہے۔ اس کے سر پر چوٹ کا بڑا سا نشان بھی نظر آ رہا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، اصل حقیقت کا کسی کو پتا نہیں چل رہا۔ آپ تصویر دیکھ کر کھوج لگائیں کہ نوجوان کی موت ڈوب کر واقع ہوئی یا کسی حادثے کا شکار ہوا تاکہ حقیقت سامنے آسکے۔

جون 2013ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے:

پولیس انسپکٹر نے دھوبی گھاٹ پر قاتل کی قمیص پر سیاہی کے دھبے دیکھ کر قاتل کا سراغ لگایا۔

جون 2013ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1۔ فضہ سکندر، سرگودھا
2۔ محمد احمد جواد، بہاول نگر
3۔ شہرین صادق، گوجرانوالہ
4۔ اقراء خان، رحیم یار خان
5۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد

ڈنمارک کی کہانی

جادو کی ہنڈیا

کشور ناہید

کسی گاؤں میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ وہ بے چارے بہت غریب تھے۔ لے دے ان کے پاس بس ایک گائے تھی۔ وہ بہت کم دودھ دیتی تھی۔ دونوں ماں بیٹے بنیے سے ادھار لے کر گزر بسر کرتے تھے۔

ایک دن بنیا عورت کے پاس آیا اور بولا: ''کل شام تک میرے سارے پیسے دے دو، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔''

بے چاری عورت کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ بنیے کا قرض کیسے ادا کرتی۔ اس نے بیٹے سے کہا کہ منڈی جا کر گائے بیچ آؤ۔ اس سے جو پیسے ملیں گے وہ بنیے کو دے دیں گے۔

لڑکا منڈی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بوڑھا ملا۔ بوڑھے کے ہاتھ میں ایک ہنڈیا تھی۔ اس نے لڑکے سے پوچھا: ''میاں، کہاں جا رہے ہو؟''

لڑکے نے بوڑھے کو ساری بات بتا دی۔ بوڑھے نے کہا: ''پریشان مت ہو۔ تم مجھے اپنی گائے دے دو۔ اس کے بدلے میں تمھیں یہ ہنڈیا دے دوں گا۔''

''لیکن میری ماں کو تو پیسے چاہئیں۔ اس کو بنیے کا قرض ادا کرنا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

بوڑھے نے کہا: ''یہ ہنڈیا بڑے کام کی ہے۔ اسے آگ پر رکھنا۔ پھر جو مانگو گے یہ تمھیں دے دے گی۔''

لڑکے نے اسے گائے دے دی اور خود ہنڈیا لے کر گھر آ گیا۔ ماں نے سارا قصہ سنا تو وہ بہت ناراض ہوئی۔ بولی: ''تو بھی کتنا بے وقوف ہے۔ اس بھدی کالی ہنڈیا کے بدلے اس بڈھے کو گائے دے دی۔'' یہ کہہ کر اس نے لڑکے کو خوب مارا۔

لیکن لڑکے کو بوڑھے کی بات کا اعتبار تھا۔ اس نے ہنڈیا کو چولہے پر رکھا۔ جیسے ہی آگ ہنڈیا کے پیندے سے لگی، اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''کھی کھی، میں جا رہی ہوں۔''

''میں بنیے کے باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔'' اور یہ کہہ کر ہنڈیا غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہنڈیا پھر آگ پر رکھی ہوئی تھی لیکن اب وہ خالی نہیں تھی۔ اس میں مزے دار پلاؤ بھرا ہوا تھا۔

ماں اور بیٹے نے پلیٹیں بھر بھر کے پلاؤ کھایا اور پھر آرام سے

لیٹ گئے مگر تھوڑی ہی دیر بعد ماں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔
''آج کا کھانا تو ہنڈیا نے دے دیا، کل کا کیا بنے گا؟''
یہ سن کر ہنڈیا بولی: ''کھی کھی، میں جا رہی ہوں۔''
''کہاں جا رہی ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔
''بنیے کے باورچی خانے میں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس میں گوشت، ترکاری اور پھل بھرے ہوئے تھے۔ دونوں ماں بیٹوں نے تمام چیزیں نکال کر الماری میں رکھ دیں لیکن کچھ دیر بعد ماں نے پھر بڑبڑانا شروع کر دیا: ''چلو خیر اس ہنڈیا نے ہمیں ایک ہفتے کے لیے کھانا تو دے دیا لیکن ہم بنیے کا قرض کیسے ادا کریں گے؟''
یہ سن کر لڑکے نے ہنڈیا چولہے پر رکھ دی۔ ہنڈیا کو آگ لگی تو وہ بولی: ''کھی کھی، میں جا رہی ہوں۔''
''کہاں جا رہی ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔
''بنیے کی تجوری میں۔'' اور وہ غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس میں ڈھیروں روپے بھرے ہوئے تھے۔ لڑکا اور اس کی ماں روپے گننے لگے۔ اتنے میں آتش دان کی چمنی میں سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ یہ آواز بنیے کی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ''بچاؤ، بچاؤ، میں مرا۔''

اصل میں ہوا یہ تھا کہ جب ہنڈیا بنیے کی تجوری میں گھسی تو بنیے نے اس کو پیسے چراتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب ہنڈیا کھڑکی میں سے اڑ کر آنے لگی تو بنیے نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا اور ہنڈیا کے ساتھ اُڑتا ہوا عورت کے گھر تک آ گیا۔ ہنڈیا آتش دان کی چمنی میں سے نکل کر گھر کے اندر چلی گئی لیکن بنیا بہت موٹا تھا وہ چمنی میں پھنس کر رہ گیا۔

لڑکے نے بنیے کو چمنی میں پھنسا ہوا دیکھا تو اس نے آتش دان میں اور لکڑیاں ڈال دیں۔ دھوئیں سے بنیے کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے چیخنا شروع کیا: ''خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ میں تمہارا سارا قرضہ معاف کرتا ہوں۔''
عورت بنیے کی مدد کے لیے بھاگی مگر لڑکے نے روکتے ہوئے کہا: ''ماں، اسے مت نکالو۔''
بنیے نے پھر فریاد کی: ''خدا کے لیے مجھے باہر نکالو، میں تمہارا قرضہ معاف کرتا ہوں بلکہ اپنی لڑکی کی شادی بھی تم سے کر دوں گا اور اپنی ساری دولت تمہیں دے دوں گا۔''
یہ سن کر لڑکا اوپر چڑھا اور بنیے کو چمنی میں سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔
ایک ہفتے بعد بنیے نے اپنی بیٹی کی شادی اس عورت کے لڑکے سے کر دی۔ اس نے اپنی ساری دولت لڑکی کو جہیز میں دے دی تھی۔
لیکن اس ہنڈیا کا کیا ہوا؟
ہنڈیا نے شادی کے دن بڑے اچھے کھانے پکائے اور پھر غائب ہو گئی۔

☆☆☆

"صاحب! یہ چھجے کے نیچے والے ٹکڑے کا کیا کروں؟ تین دن سے یہاں سیڑھی بے کار کھڑی ہے؟" بابو خان رنگ والے نے ماتھے پر بہتے پسینے کے ریلے کو انگلی کے وائپر سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایں...... ہاں...... اچھا...... اچھا کچھ کرتے ہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔

پچھلے تین دن سے پورا گھر ایک اہم مسئلہ میں الجھا ہوا تھا۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ گھر میں رنگ و روغن کا کام جاری تھا۔ جنوبی دیوار کے چھجے کے نیچے اے۔ سی کی اسٹیل کی جالی کے اوپر چڑیا نے نہ جانے کب گھونسلا بنا لیا تھا۔ بابو خان رنگ کرتا ہوا جب اس مقام پر پہنچا تو چڑیا کا گھونسلا وہاں سے ہٹانا چاہا۔ ابھی اس نے گھونسلے کا ایک کونا ہی الگ کیا تھا کہ نیچے مٹی کی تہہ میں فینائل کی گولیوں جیسے تین ننھے ننھے انڈے نظر آئے۔ بابو خان کی جو شامت آئی تو وہ لان میں کھیلتے ننھے امان اور ایان سے کہہ بیٹھے۔

"امان! نانا جان سے معلوم کر کے آؤ کہ چڑیا کے انڈے کہاں پھینکوں؟"

"بابو بھائی خبردار! اگر انڈوں کو ہاتھ لگایا تو ہم سیڑھی کھینچ کر آپ کو گرا دیں گے۔ ہم ابھی نانا جان کو بتاتے ہیں۔" امان اور ایان چیخے۔

دونوں بچے جب میرے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور ہانپتے ہوئے یہ بریکنگ نیوز سنائی تو انڈوں کا سن کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اسی دوران بابو خان بھی سر سہلاتے ہوئے آ گئے اور کہنے لگے۔

"صاحب! یہ چڑا اور چڑیا بہت شریر ہیں۔ میں جیسے ہی گھونسلے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں تو یہ شیطان نا صرف چیں...... چیں...... کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں بلکہ میرے گنجے سر پر ٹھونگیں بھی مارتے ہیں۔"

اسی دوران امان میاں کی نانی بھی جرگے میں شریک ہو گئیں۔ انہوں نے اس معاملہ کو ایک اور خطرناک موڑ دے دیا اور بابو خان کو ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

"اے ہے اللہ مارے! معصوم بے زبان پرندوں کا گھر مت اجاڑیو۔ ہمارے بچپن میں چندو کمہار نے ایک بار نیم کے درخت سے فاختہ کا گھونسلا ہٹایا تھا۔ اگلے دن اس کے داہنے ہاتھ پر فالج

گر گیا تھا۔"

"سچی اماں!......" بابو خان نے حیرت اور خوف سے منہ پھاڑ کر اپنے ہاتھوں کو ہلا کر اطمینان کیا۔

آخر کار یہ طے پایا کہ امان میاں، نانا جان کی الماری سے جوتوں کا خالی ڈبہ لائیں گے اور چڑیوں کے لیے شان دار گھر تیار ہو گا۔ اس طرح سب کی اجتماعی کوششوں سے ڈبے کو رنگ برنگی چمکیلی پنیوں سے سجایا گیا۔ اس کے اندر روئی اور فوم کے ٹکڑوں کی مدد سے آرام دہ بستر تیار کیا۔ پنسل کے نشان مٹانے والی دو ربروں سے دو ننھے ننھے تکیے تیار کیے گئے۔ ایان میاں نے سنہرے مارکر سے بیرونی دیوار پر Sweet Home بھی لکھ دیا۔ بابو خان سر پر تولیہ لپیٹ کر سیڑھی پر چڑھے اور انڈوں کو نئے گھر میں شفٹ کر دیا۔

اگلے دن صبح کو جب میں چہل قدمی کر کے واپس آیا اور چھجے پر نظر ڈالی تو دیکھا چڑا اور چڑیا اپنے پرانے گھر کی شکستہ دیوار پر اداس بیٹھے ہیں اور نیا گھر یونہی ویران پڑا ہے۔

دوپہر کو امان اور ایان کی قیادت میں ایک بار پھر جرگہ بیٹھا۔ اتفاق سے آج قیوم ماموں بھی آئے ہوئے تھے جو شہر کے معروف آرکیٹکٹ تھے۔ جب معاملہ ماموں کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے فلسفیانہ انداز میں رائے دی۔

"پرندے تنکوں سے اپنا گھر اس لیے بناتے ہیں کہ وہ نا صرف آرام دہ ہوتا ہے بلکہ ان میں درختوں اور پھولوں کی خوشبو بھی بسی ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں تنکوں ہی سے ان کا آشیانہ بنانا چاہیے۔"

ماموں کی اس قیمتی رائے کو سراہتے ہوئے سب بے کار سوکھی ٹہنیاں، تنکے، پتے اور پرندوں کے پَر اکٹھے کرنے میں جت گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں اچھا خاصا مال جمع ہو گیا۔ ماموں کی سربراہی میں بہت کوشش کی گئی کہ چڑیوں جیسا گھونسلا تیار کیا جائے لیکن شہر کے معروف آرکیٹکٹ بھی ایسا گھونسلا تیار کرنے میں ناکام رہے۔ بہت کوشش کے بعد ایک بے ڈول، ٹوکری نما گھونسلا یا گھونسلا نما ٹوکری وجود میں آئی۔ آخر میں ٹیپ اور دھاگے کی مدد سے اس کو کچھ معقول شکل دینے کی کوشش کی گئی۔ اسی دوران چڑا اور چڑیا بھی سامنے والی امرود کی شاخ پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور اس شاہ کار کو دیکھ کر گردن نفی میں ہلا رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

"اونہہ...... hopless...... انسانو تم کیا جانو تنکوں سے محل بنانے کا فن۔"

بہرحال ماموں کے اس تعمیراتی شاہ کار کو لے کر بابو خان پھر سیڑھی پر ڈرتے ڈرتے چڑھے اور گتے کے آشیانے کی جگہ نیا گھونسلا رکھ دیا۔ رشوت کے طور پر اس میں مکئی اور باجرے کے دانوں کے علاوہ دو کٹ کیٹ کی ٹافیاں بھی رکھ دی گئی تھیں۔ اب ہم سب دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو کر اپنے کارنامے کا انجام دیکھنے کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد چڑا اور چڑیا چیں چیں کرتے آئے۔ پہلے تو انہوں نے گھر کے چاروں طرف گھوم کر اس کا معائنہ کیا، پھر نہایت حقارت سے اس کو مسترد کرتے ہوئے اپنے پرانے گھر کی شکستہ دیوار پر جا بیٹھے۔

آج ان دونوں کی آنکھوں میں بے چینی، بے بسی اور وحشت زیادہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بقول بابو خان انڈوں کے منہ پر چاول برابر چھید تھی۔ شاید تین چونچیں باہر نکلنے کے لیے بے چین تھیں۔

کچھ دیر بعد امان کی نانی تسبیح گھماتی ادھر آ نکلیں اور معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بولیں۔

"ارے کاہے کو تم لوگ ان بے زبانوں کو ہلکان کر رہے ہو۔ ان کے انڈے ان کے پرانے گھونسلے میں ہی رکھ دو۔ اگر دیوار کے اس ذرا سے ٹکڑے پر رنگ نہیں ہوگا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔"

امان کی نانی کو ویٹو پاور حاصل تھی، اس لیے ایک بار پھر بابو خان سر پر آٹا گوندھنے کا تسلہ سجائے تھکے تھکے قدموں سے سیڑھی پر چڑھے اور انڈوں کو چڑیوں کے آبائی گھر میں منتقل کر آئے۔ اس دوران چڑا اور چڑیا ان کے سر پر منڈلاتے رہے اور ان کے اترتے ہی خوشی سے چیں چیں کرتے گھونسلے میں جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں باہر نکل کر گھر کی مرمت میں جت گئے اور شام تک نئے تنکوں سے اپنے گھر کو آراستہ کر لیا۔

تین چار دن بعد ہم نے محسوس کیا کہ اب گھونسلے میں چیں چیں کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا ہے کیوں کہ اب یہ آوازیں شاید دو کے بجائے پانچ چونچوں سے نکل رہی تھیں۔

اس واقعہ کو پانچ سال گزر گئے ہیں۔ اب شاید ان چڑیوں کی چوتھی نسل آباد ہے۔ دیوار کا وہ حصہ آج بھی رنگ و روغن سے محروم ہے، پھر بھی سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔

☆......☆......☆

- پانی کا وہ تنگ حصہ جو بڑے پانیوں کو باہم ملاتا ہے، اصطلاح میں اسے "آبنائے" کہتے ہیں۔
- اس خط کو "افق" کہا جاتا ہے جہاں زمین اور آسمان باہم ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
- خشکی کا وہ ٹکڑا جو تین اطراف سے پانی اور ایک طرف سے خشکی سے گھرا ہو، جزیرہ نما کہلاتا ہے۔ خشکی کا وہ ٹکڑا جو چاروں طرف سمندر سے گھرا ہو جزیرہ کہلاتا ہے۔
- خاکنائے خشکی کا وہ تنگ ٹکڑا ہے جو خشکی کے دو بڑے حصوں کو ملاتا ہے۔ (آمنہ کرن، فیصل آباد)
- موجوں سے توانائی حاصل کرنے والے آلے کو رسل ریکٹی فائر کہا جاتا ہے اور یہ برطانیہ کے رابرٹ رسل نے ایجاد کیا۔
- جگنو کی روشنی حرارت کے بغیر پیدا ہوتی ہے۔
- اگر سونے پر پارہ گر جائے تو وہ چاندی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
- شیشے کے بنیادی اجزاء سوڈا، ریت اور چونا ہیں۔
- خشک کاغذ میں 10 فیصد پانی ہوتا ہے۔
- دورانِ خون کا اصول ولیم ہاروے نے دریافت کیا۔
- "نیوٹن ثانی" کا خطاب البرٹ آئن سٹائن کو دیا گیا ہے۔
- کلورین گیس کا رنگ سبزی مائل زرد ہوتا ہے۔
- کیمیا عربی زبان کا لفظ ہے۔ (نعمان فاروق، ٹوبہ ٹیک سنگھ)
- قرآن پاک کی 18 سورتیں دو دو پاروں میں ہیں۔
- مکہ میں قرآن پاک کے سب سے پہلے کاتب شرجیل بن حسنہؓ تھے۔
- جرمنی میں قرآن پاک 15 ویں صدی میں روشناس ہوا۔
- نزول کے اعتبار سے سورۃ فاتحہ کا نمبر پانچواں ہے۔
- جنگ فجار کے وقت حضرت محمدؐ کی عمر مبارک پندرہ برس تھی۔
- نبیؐ کے دادا عبدالمطلب کی کنیت ابوالحارث تھی۔
- قرآن پاک کی باآواز بلند تلاوت کرنے والے صحابی عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ (محمد بلال، قصور)
- پولو میں استعمال ہونے والی گیند بید کی جڑ سے بنی ہوتی ہے۔
- پولو میں استعمال ہونے والی چھڑی بانس کی بنی ہوتی ہے۔
- ہندوستان کے بادشاہ قطب الدین ایبک کا انتقال پولو کھیلتے ہوئے ہوا تھا۔
- کوئین کپ پولو میں انعام کے طور پر دیا جاتا ہے۔
- پولو میں استعمال ہونے والی گیند کا وزن 5 اونس ہوتا ہے۔
- ایران کے شاعر فردوسی نے اپنے اشعار میں پولو کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ (ملائکہ اشفاق، رحیم یار خان)
- پاکستان کا معیاری وقت 1951ء میں مقرر کیا گیا۔
- پاکستان کی دستوری کتاب کا رنگ سفید ہے۔
- دریائے سندھ کا دوسرا نام اباسین ہے۔
- بادشاہی مسجد کا دوسرا نام عالم گیر مسجد ہے۔
- پاکستان میں 23 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ (اسد اکرم، ملتان)
- علامہ محمد اقبال نے نظم "التجائے مسافر" (بانگِ درا) 1905ء میں صوفی بزرگ نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر پڑھی تھی۔
- علامہ اقبالؒ نے نظم "شمع اور شاعر" 1912ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ترنم کے ساتھ پڑھی تھی۔
- "جواب شکوہ" علامہ اقبالؒ نے 1912ء میں موچی دروازہ کے "باغ" کے مقام پر جلسہ عام میں پڑھی۔
- اقبالؒ نے نظم "خضر راہ" انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں 1922ء میں پڑھی جو اسلامیہ ہائی سکول، شیرانوالہ دروازہ میں منعقد ہوا۔
- دنیا میں سب سے زیادہ پہاڑ سوئٹزرلینڈ میں پائے جاتے ہیں۔
- یورپ کے سب سے بڑے پہاڑ کا نام ماؤنٹ بلانگ ہے۔
- دنیا کا سب سے بڑا اور لمبا پہاڑی سلسلہ کوہ انڈیز ہے۔
- دنیا کی سب سے بڑی جہازی نہر سوئیز ہے۔
- بحیرہ قلزم کا دوسرا نام بحیرۂ احمر ہے۔
- آگ کی جھیل جزیرہ ہوائی میں واقع ہے۔
- سری لنکا کا پرانا نام سیلون تھا۔ (صدام صادق، راول پنڈی)

تبت کا سفر

ندیم، چاچی، ضرار، بلال اور آصف نے تبت کے سفر کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے ضروری چیزیں راول پنڈی سے خریدیں اور پھر کراچی چلے گئے۔ کراچی میں وہ ایک عام سے ہوٹل میں ٹھہرے کیوں کہ وہ اپنی ہر بات کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔

کراچی آئے ہوئے انھیں چار ہفتے گزر چکے تھے۔ کیپٹن ندیم نے ہوائی جہاز بنانے والی ایک مشہور کمپنی سے خط و کتابت اور ٹیلی فون کے ذریعے ایک جہاز خرید لیا تھا۔ یہ دو انجنوں والا جہاز تمام کا تمام دھات کا بنا ہوا تھا اور اس کا نام انھوں نے ''شاہین'' رکھا تھا۔

آخر وہ مبارک وقت آ گیا جب وہ تبت کی مہم پر روانہ ہونے کے لیے جہاز کے اندر بیٹھے۔ سب نے دعائیں مانگیں۔ ندیم نے شاہین کو سٹارٹ کیا۔ کراچی سے اُڑتے ہوئے وہ بھارت کے علاقے پر سے گزرے اور چٹاگانگ کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔

چٹاگانگ میں انھوں نے ایک عمدہ ہوٹل میں اپنا سامان اتارا۔ ندیم نے کاغذی کارروائیوں کو شام تک مکمل کر لیا۔ شام کے وقت وہ سب ہوٹل میں بیٹھے بحث کر رہے تھے۔ ندیم کہہ رہا تھا:

''سب سے مشکل بات یہ ہے کہ ہمیں پتا نہیں کہ ہمیں کہاں اترنا ہے۔ خدا معلوم یہ نیلا پہاڑ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ ایسی صورت میں سفر بے حد خطرناک ہوا کرتا ہے۔''

چاچی نے کہا۔ ''میں نے کوہِ نور کی طرف جانے والے راستے کے نقشے بڑی احتیاط سے بنائے ہیں۔''

''آخر ان نقشوں کو پھر نکالا گیا۔ ایک جگہ پہاڑیوں میں گھرے ہوئے نقشے پر ''کوہِ نور'' لکھا ہوا تھا۔ ندیم اس نقشے کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ندیم اور چاچی دیر تک بحث کرتے رہے۔ آخر ندیم نے کچھ گراف پیپر لیے اور ان پر اپنے سفر کا راستہ بنانے لگا۔

پھر انھوں نے ''شاہین'' میں پٹرول بھرا اور چند ڈرم پٹرول کے اپنے ساتھ رکھ لیے تاکہ اگر وہ ''کوہِ نور'' تک نہ پہنچ سکے اور کسی غلط راستے پر پڑ گئے تو واپس آنے کے لیے ان کے پاس کافی پٹرول موجود ہونا چاہیے۔

''اب ہم کوہِ نور کس وقت روانہ ہو رہے ہیں؟'' آصف نے پوچھا۔ ''کل صبح دس بجے۔'' ندیم نے جواب دیا۔

"ہمارا کل سفر کتنا ہوگا؟" ضرار نے پوچھا۔

"آٹھ دس گھنٹوں کا یا زیادہ۔" ندیم نے جواب دیا۔

"کیا جہاز کے انجن بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں؟" چاچی نے پوچھا۔

"سو فی صد۔" ندیم بولا۔

پھر انھوں نے چائے منگوائی۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور پھر سب سو گئے۔

صبح سویرے اٹھ کر انھوں نے غسل کیا، کپڑے پہنے اور ناشتے سے فارغ ہو کر جہاز میں جا بیٹھے۔ ندیم نے انجن سٹارٹ کیا اور شاہین کو نیلے آسمان میں لے گیا۔

راستے میں دریائے گنگا بھورے رنگ کے دھاگے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پہاڑوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر سے گزر رہے تھے۔ راستے میں انھوں نے مختلف جگہیں دیکھیں۔ آگے اونچی اونچی چوٹیاں شروع ہو گئیں۔ ندیم کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کا جہاز ٹکرا نہ جائے۔ وہ جہاز کو اور اونچا لے گیا اور وہ آہستہ آہستہ سمندر کی سطح سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنے لگا۔

"مجھے ایک سموسہ دینا ضرار۔" ندیم نے کہا اور ضرار نے اسے سموسہ تھما دیا۔ "پانچ بج گئے ہیں۔" چاچی نے گھڑی دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

ندیم نے جہاز کی رفتار کچھ اور تیز کر دی تھی۔ وہ سمندر کی سطح سے سولہ ہزار فٹ اونچے اڑ رہے تھے مگر پہاڑ ان سے صرف ایک ہزار فٹ نیچے تھے۔ اچانک پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جن کی چوٹیاں نوکیلی تھیں۔ تمام پہاڑیاں ویران تھیں۔ میلوں تک کوئی انسان، مکان، چرند پرند کچھ نظر نہ آتا تھا۔

وہ حیران تھے کہ اگر کوہ نور یہیں کہیں ہے تو اس کے بارے میں پوچھیں گے کس سے؟ کیپٹن ندیم اپنی جگہ سے اٹھا اور ضرار، چاچی اور آصف کے پاس بیٹھ گیا۔ اب جہاز کو بلال چلا رہا تھا۔

"میرے خیال میں ہمیں اب جہاز کو کچھ دیر کے لیے زمین پر اتار لینا چاہیے۔" ندیم نے چاچی سے کہا۔

"جیسا تم مناسب سمجھو۔" چاچی نے کہا۔

ندیم نے گردن گھما کر بلال کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" ندیم نے پوچھا۔ "گھبرائے ہوئے کیوں؟"

"یہ جہاز کے انجنوں سے آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟" بلال نے کہا۔

ندیم اُٹھ کر واپس اندر والے کمرے میں چلا گیا اور غور سے سوئیوں کو دیکھا۔ دونوں سوئیاں نیچے گر رہی تھیں جیسے انجن خراب ہو گئے ہوں۔ ندیم بھی پریشان ہو گیا۔ اب انجنوں میں سے گھرر گھرر کی آوازیں اور بلند ہو گئیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ دُور اور گئے تو دونوں انجن بند ہو جائیں گے۔

"بلال!" ندیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آگے جانے میں خطرہ ہے۔ یہیں کہیں اترنے کا بندوبست کرو۔"

انجن آہستہ آہستہ بند ہو رہے تھے اور ان میں سے اٹھتا ہوا شور بہت بلند ہو گیا تھا۔ سب ڈر گئے۔

"میرے خیال میں وہ جگہ ٹھیک رہے گی۔" بلال نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔

بلال نے ایک چکر لگایا اور بڑی ہشیاری سے پہاڑیوں کے درمیان درختوں کے ایک لمبے چوڑے جھنڈ میں جہاز اتار لیا۔ سب لوگ جہاز سے باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

کوہ نور

کیپٹن ندیم، بلال، ضرار، چاچی اور آصف گھاس پر کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"اب کیا کریں؟" چاچی نے پوچھا۔

"جہاز کی ٹینکی میں پٹرول ختم ہو چکا ہے۔" ندیم بولا۔

"سب سے پہلے ہم چاروں خالی ٹینکیوں میں پٹرول بھریں گے۔ میں اور بلال انجنوں کو چیک کریں گے اور پھر سب کھانا کھائیں گے۔"

چاروں نے مل کر پٹرول نکالا اور بڑی احتیاط سے جہاز میں بھرنے لگے۔ بلال اور ندیم انجن چیک کرنے لگے۔ ضرار اور آصف نے جہاز سے خیمہ نکال کر زمین پر اچھی طرح سے گاڑ دیا۔ پھر انھوں نے قالین نکال کر بچھا دیا۔ کھانا گرم کیا اور سب کھانے لگے۔

کھانا کھاتے ہوئے چاچی نے کہا۔ ''جہاز میں کوئی نقص ہے؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' ندیم نے جواب دیا...... ''کہ آخر یکا یک انجنوں کو ہو کیا گیا ہے۔ جب ہم کراچی سے چلے تھے تو میں نے خود ایک ایک پرزے کو چیک کیا تھا۔ چٹا گانگ سے یہاں تک سارا راستہ جہاز ٹھیک چلتا رہا۔ بلال اور میں نے اسے پھر چیک کیا ہے مگر ہمیں تو انجنوں میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔''

''سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں انجن ایک ساتھ خراب ہوئے ہیں۔'' بلال نے کہا۔

''بالکل! بالکل! میں خود یہی سوچ رہا ہوں۔'' ندیم نے کہا۔ ''اگر ایک انجن خراب ہوتا تو میں سوچتا کہ شاید اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے لیکن اس پہاڑی کے نزدیک پہنچتے ہی دونوں گھر گھر کرنے لگے۔ ہماری قسمت اچھی تھی جو اسے صحیح وقت پر زمین پر اتار لائے، ورنہ ہو سکتا ہے کوئی حادثہ پیش آ جاتا۔ کیا اس پہاڑ کا تو اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا جس کی تلاش میں ہم یہاں تک آئے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' بلال نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''اس پہاڑ میں سے نکلنے والی نیلی شعاعوں کی وجہ سے تو انجنوں میں گڑبڑ نہیں ہوئی؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو؟'' بلال بولا۔

''بھئی ایسا ممکن تو ہے۔'' چاچی نے کہا۔

''خیر اس کے بارے میں بھی سوچیں گے۔'' ندیم نے کہا۔ ''پہلے کھانے سے تو فارغ ہو لیں۔''

انھوں نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا۔ برتن خیمے میں رکھے اور پھر قالین پر آ کر بیٹھ گئے۔ ضرار نے کہا۔ ''میں جہاز میں آٹھ گھنٹے بیٹھے رہنے کی وجہ سے تنگ آ گیا ہوں۔ اس لیے چہل قدمی کے لیے سامنے والی ندی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی ڈبا تھا جسے اس نے پانی سے بھر لیا اور پھر وہ کافی دُور نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ندیم نے اسے آواز دی کہ واپس آ جاؤ۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کی ایک گندی سی چیز تھی جسے اس نے زمین پر پھینک دیا۔ سب اسے غور سے دیکھنے لگے۔

''یہ کیا ہے؟'' چاچی نے پوچھا اور پھر خود ہی بولے۔

''اوہ! یہ تو کن کھجورا ہے۔ اُف! اتنا بڑا کن کھجورا میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔''

''عجیب قسم کا کن کھجورا ہے۔'' ضرار بولا۔ ''اس کی جلد مینڈک کی طرح اور پیٹ مچھلی کا سا ہے۔ منہ شارک مچھلی سے ملتا جلتا ہے اور دانت اندر کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔''

''گدھے، اس قسم کی بے کار چیزیں مت لاؤ۔'' ندیم نے ناراض ہوتے ہوئے ضرار سے کہا۔

''تو پھر کس قسم کی چیزیں لاؤں؟'' ضرار نے کہا اور ندیم کی ہنسی نکل گئی۔ ضرار نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نوکیلی چھڑی کن کھجورے کے پیٹ میں بھونک دی اور اس کے پیٹ سے سرخ رنگ کے خون کی دھار بہنے لگی۔ پھر وہ اس طرح سکڑ گیا جیسے ہوا نکل جانے پر غبارہ سکڑ جاتا ہے۔

چاچی نے یہ دیکھ کر غصے سے کہا۔ ''ضرار، اسے دفان کرو۔ یہاں سے کس قدر بدبو ہے اس کے جسم میں۔'' انھوں نے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ ضرار نے چھڑی کی نوک سے کن کھجورا اٹھا کر پرے پھینک دیا۔

اندھیرا چھا رہا تھا اور سردی بہت تھی۔ ندیم نے کہا کہ اگر تھوڑی دیر سیر کر لی جائے تو جسم میں چستی آ جائے گی۔ سب نے ندیم کی بات مان لی اور وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے پاس ایک بارہ بور کی دو نالی بندوق، ایک ریوالور اور ایک رائفل تھی۔ انھوں نے گولیاں بھریں اور پھر سیر کے لیے چل پڑے۔

''میرے اللہ!'' چاچی نے کہا۔ ''دُور دُور تک کوئی چرند پرند نظر نہیں آتا۔ عجیب پہاڑیاں ہیں یہ۔''

ندیم نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''چاند ابھی نہیں نکلا۔ اُف! ستارے کس قدر خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔'' آصف نے کہا۔

''ارے!'' ندیم نے کہا اور چلتے چلتے ایک دم ٹھہر گیا۔

''کیا بات ہے؟'' چاچی نے پوچھا۔

''وہ پہاڑی دیکھتے ہیں آپ؟'' ندیم نے اشارہ کر کے کہا۔ ''دیکھیے اس پہاڑی کے چاروں طرف کس قدر خوب صورت روشنی

پھیلی ہوئی ہے۔'' سب غور سے اسی طرف دیکھنے لگے۔ کافی دُور ایک پہاڑی پر سے نیلے رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔ یہ روشنی ستاروں کی طرح لگاتار نہیں تھی بلکہ جلتی بجھتی تھی۔

''اُف میرے اللہ!'' چاچی نے کہا۔ ''ایسی خوب صورت روشنی میں نے عمر بھر نہیں دیکھی لیکن اس کی رنگت نیلی کیوں ہے؟''

''میرے خیال میں یہ شمالی روشنی ہے۔'' ضرار نے کہا۔ ''کیا خیال ہے آپ کا کیپٹن؟''

ندیم کسی گہری سوچ میں تھا۔ کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں تو یہ وہی پہاڑ ہے جس کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔''

''ہائیں......'' چاچی کے منہ سے حیرت سے نکلا اور پھر سب ندیم کا منہ تکنے لگے۔

''یقین نہیں آتا...... لیکن...... لیکن۔'' چاچی نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز نہ نکل سکی۔

تھوڑی دیر بعد ندیم بولا۔ ''میں چند منٹ میں آپ کو بتا دوں گا کہ یہ کوہِ نور ہے یا کوئی اور پہاڑ۔''

''وہ کیسے؟'' چاچی نے پوچھا۔

''میں اس سامنے والی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھوں گا......''

''میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔'' چاچی نے کہا۔

''اور میں بھی چلوں گا۔'' ضرار نے کہا۔

''ہم سب چلتے ہیں۔'' ندیم نے کہا۔

ان کے قریب ہی ایک پہاڑی تھی۔ سب اسی کی طرف چلنے لگے۔ وہ سمجھتے تھے کہ چوٹی قریب ہی ہے مگر وہ ان کے اندازے سے دُور نکلی۔ آخر وہ اس چوٹی پر چڑھ گئے۔ اب وہ اس روشنی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ روشنی نیلے رنگ کی تھی اور قریب ہی ایک پہاڑی سے نکل رہی تھی۔ نیلی شعاعیں آسمان کی جانب چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ ان کی چمک اتنی زیادہ تھی کہ ان کو اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھ رکھنا پڑے۔

''یہ وہی کوہِ نور ہے۔'' ندیم نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' چاچی بولے۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پہاڑی میں اتنی ریڈیم موجود ہے کہ اس کا مالک ساری دُنیا کو خرید سکتا ہے۔''

''اور اگر چاہے تو اس ریڈیم سے ساری دُنیا کے مریضوں کا علاج کر سکتا ہے۔'' آصف نے کہا۔

''تم کیا کر رہے ہو؟'' چاچی نے پوچھا۔

''یہ میرے پاس قطب نما ہے۔ میں اس پہاڑی کی سمت معلوم کر رہا ہوں کہ کل صبح جب ہم واپس یہاں آئیں گے تو دن ہونے کی وجہ سے اس پہاڑی میں سے روشنی نہیں نکل رہی ہو گی۔ اس طرح اسے ڈھونڈنے میں مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' ندیم نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔'' چاچی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''کیپٹن، یہ پہاڑی یہاں سے کتنی دُور ہو گی؟'' آصف نے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا اندازہ ہے کہ چار میل سے کم اور سات میل سے زیادہ دُور نہیں ہو سکتی۔''

اس کے بعد وہ آدھ گھنٹے وہاں بیٹھے۔ کوہِ نور کی خوب صورت نیلی روشنی کو دیکھتے رہے۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی اس لیے وہ واپس خیمے کی طرف چل پڑے۔

''میرے خیال میں آج ہم نے بہت سا کام کر لیا ہے۔'' ندیم بولا۔ ''سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس پہاڑی کی ہمیں تلاش تھی وہ ہم نے ڈھونڈ لی ہے۔ انشاء اللہ کل ہم اس پہاڑی پر کھڑے ہوں گے۔''

''کھڑے ہوں گے؟'' ضرار نے حیران ہو کر کہا۔ ''کیا ہم پیدل وہاں جائیں گے؟''

ندیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم جہاز میں وہاں نہیں جا سکتے کیوں کہ پہاڑی کے ریڈیم سے نکلنے والی شعاعوں کی وجہ سے ہی ہمارے جہاز کے اچھے بھلے انجن بند ہوئے تھے۔ خیر یہ تو کل ہی پتا چلے گا۔ اگر ہمارا جہاز کل نہ اُڑ سکا تو پھر پیدل وہاں جانا ہو گا۔ بہرحال جب یہاں تک آ پہنچے ہیں تو پھر کچھ نہ کچھ ریڈیم لے کر ہی اب پاکستان لوٹیں گے۔ اب رات کافی ہو چکی ہے۔ ہمیں سونے کی تیاری کرنی چاہیے۔''

وہ خیمے تک پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے بستر بچھائے اور ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر سو گئے۔

جینٹل مین

(قراۃ العین خرم ہاشمی، لاہور)

لاہور اسٹیشن پہ حسب معمول بہت رش تھا۔ زندگی بھی وقت کی ریل کا ایک سفر ہے۔ جس طرح اس کے رنگ بہت سے ہیں اسی طرح یہاں بھی ہر چہرے کی اپنی کہانی ہے، اپنا اپنا سفر ہے، اپنی اپنی منزل ہے۔ لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین اب چلنے ہی والی تھی۔ تقریباً سارے مسافر اپنی اپنی سیٹوں پہ بیٹھ گئے تھے۔

وہ دونوں دوست بھی اسی ٹرین میں سوار تھے۔ دونوں کی عمریں لگ بھگ 60 برس کے قریب تھیں۔ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ اس میں سے ایک کا نام احسان ملک اور دوسرے کا نام احمد علی تھا۔ دونوں باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ، اسٹیشن کی رونقیں بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے والی برتھ فی الحال خالی تھی۔ ٹرین چلنے سے کچھ دیر پہلے ایک نوجوان کپل اندر داخل ہوا۔ دونوں اپنے حلیے سے بہت ''ماڈرن'' نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے انگلش میں بات کر رہے تھے۔ دو ''بابوں'' کو دھوتی کُرتے میں ملبوس دیکھ کر دونوں کے منہ بن گئے۔

''او مائی گاڈ! اب ان اجڈ گنوار لوگوں کے ساتھ کراچی تک کا سفر کرنا پڑے گا۔'' لڑکی جس کا نام کشمالہ تھا اس نے انگلش میں اپنے شوہر خاور سے کہا۔

''بس مجبوری ہے! کراچی جانا بہت ضروری ہے اور فی الحال کہیں اور سیٹس بھی نہیں مل رہی تھی۔ اب برداشت تو کرنا پڑے گا......'' اس کے شوہر خاور نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہم انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہماری ''جلد بازی'' ہے۔ ہم بہت جلد دوسروں کے بارے میں ''رائے'' قائم کر لیتے ہیں۔ کشمالہ اور خاور بھی یہی کر رہے تھے۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور منظر پیچھے کو بھاگ رہے تھے۔

احسان ملک اور احمد علی نے دونوں کے بنتے بگڑتے منہ کے زاویوں کو دیکھ لیا تھا مگر انہیں نظر انداز کر کے اپنی باتوں میں مگن رہے۔ انہیں پنجابی میں بولتا دیکھ کر کشمالہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

''پینڈو لوگ......!'' کہہ کر ہیڈ فون لگا کر میوزک انجوائے کرنے لگی۔

رات کا اندھیرا ہر سُو پھیلنے لگا تھا۔ کھانے کا وقت ہوا تو دونوں ''بابوں'' نے اپنے ساتھ لیا ہوا کھانا کھولنے لگے۔ انہوں نے کشمالہ اور خاور کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی پیش کش کی جسے ان دونوں نے نخوت سے منع کر دیا۔

احسان ملک اور احمد علی دونوں جانتے تھے کہ وہ منع کر دیں گے کیوں کہ سارا راستہ وہ اسی طرح ہر چیز کے لیے منع کرتے آئے تھے۔ خیر دونوں نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔

انہیں کھانا کھاتے دیکھ کر کشمالہ نے خاور سے انگریزی میں کہا۔

''سارے راستے میں جب بھی یہ ''اولڈ مین'' کچھ کھانے لگتے ہیں، ہم سے ضرور پوچھتے ہیں۔ حالانکہ جب ایک بار ہم نے منع کر دیا ہے، پھر یہ بار بار اصرار کیوں کرتے ہیں؟ بار بار ہماری پرائیویسی میں دخل دیتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہوتے تو کچھ ''مینرز'' بھی آتے۔''

خاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد کشمالہ اور خاور نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد دونوں نے حسب معمول تبصرے کرنے شروع کر دیے۔ وہ دونوں ہر چیز سے نالاں تھے۔ اپنے ملک سے، حالات سے، سسٹم سے، حتیٰ کہ لوگوں سے بھی......

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ساری کائنات میں زندگی دوڑنے لگی تھی۔ کراچی اب کچھ دیر کی مسافت پہ تھا۔ سب لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ احسان ملک اور احمد علی ناشتہ کر کے

فارغ بیٹھے تھے۔ کشمالہ اور خاور دیر سے جاگے تھے۔
کچھ دیر کے بعد احسان ملک اور احمد علی تیار ہو گئے۔ کل والے حلیے سے یکسر مختلف حلیے میں دونوں کو دیکھ کر کشمالہ اور خاور حیران رہ گئے۔
کل انہیں دھوتی کُرتے میں دیکھ کر وہ انہیں عام سے دیہاتی لوگ سمجھے تھے، مگر اب بہترین سوٹ میں ملبوس دیکھ کر دونوں دنگ رہ گئے۔
دونوں اپنی حیرانی کو چھپائے ناشتہ کرنے لگے۔ اتنی دیر میں احمد علی نے اسٹیشن سے انگریزی کا نیوز پیپر خریدا۔ انہوں نے نفیس سی عینک لگائی ہوئی تھی اور وہ خبریں پڑھ پڑھ کر اپنے دوست کو سنا رہے تھے۔ احسان ملک ساتھ ساتھ ہر خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔
دونوں کو اتنی روانی سے انگلش بولتے دیکھ کر کشمالہ اور خاور گم سم سے ہو گئے۔ دونوں ناشتہ کرنا بھول گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔
احسان ملک اور احمد علی نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا اور زیرِ لب مسکرا دیے۔
کشمالہ اور خاور کا شرمندگی کے مارے بہت بُرا حال تھا۔ اپنی برتری کے زعم میں کسی کو خود سے کم سمجھنا، کبھی کبھی ایسے ہی منہ کے بل گراتا ہے۔
ٹرین کراچی اسٹیشن پر رُک چکی تھی۔ احسان ملک اور احمد علی اپنا اپنا سامان اٹھائے، جو ایک ایک بیگ پر مشتمل تھا، اترنے لگے تو خاور نے شرمندگی سے کہا۔
''آئی ایم سوری سر! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ.........''
''ایک منٹ پلیز.....'' احسان ملک نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے بولنے سے روکا۔
''اگر آپ کو ''اندازہ'' ہوتا تو کیا آپ یہ سب نہیں کرتے؟ کیا آپ دوسروں کی عزت اپنی مورل ویلیوز کی بجائے ''اندازے'' سے کرتے ہیں..... آپ لوگوں کے نزدیک ''عزت'' کا معیار کسی کا ''ظاہر'' ہے۔ اُس کا ''باطن'' نہیں ہے ناں.....!!''

''نہیں سر! ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔'' کشمالہ نے جلدی سے وضاحت دینے کی کوشش کی۔
''اپنی روایات، لباس کو چھوڑ دینا قابلِ فخر نہیں ہے۔'' احمد علی نے کہنا شروع کیا۔
بُری بات تو یہ ہے کہ جو آپ ''اندر'' سے نہ ہوں، وہ اپنا ''ظاہر'' بنا کر پیش کریں۔ پینڈو، سادہ، دیہاتی جو بھی آپ کہہ لیں یہ پیمانہ نہیں ہے کسی بھی ''انسان'' کو پہچاننے یا ''عزت'' دینے کا......''
احمد علی نے توقف کیا اور پھر بولے۔
''ہاں بیٹا! اگر آپ کا حاصل کیا ہوا ''علم'' آپ کو ''انسانیت'' کی عزت کرنا نہیں سکھاتا تو آپ جان لیں کہ آپ نے کبھی ''علم'' حاصل ہی نہیں کیا۔ ہاں دنیاوی نظر سے ڈگری ضرور لے لی ہے۔!!''
''ایک اور بات.....'' احسان ملک نے کشمالہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''کسی کو بھی کھانے کے وقت پیش کش کرنا یا کوئی بھی چیز کھانے یا پینے سے پہلے پوچھنا ''اخلاقیات'' مینرز کہلاتا ہے۔ کسی کی ''پرائیویسی'' کو ڈسٹرب کرنا نہیں کہتے اسے۔ خیر ہمارا مقصد آپ لوگوں کو شرمندہ کرنا نہیں تھا بلکہ آپ کے غلط رویئے کی نشان دہی کرنا تھا۔ آئی ہوپ آپ لوگوں نے بُرا نہیں مانا ہوگا۔'' احسان ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام احسان ملک ہے اور یہ میرے دوست کرنل (ریٹائرڈ) احمد علی ہیں۔ تعارف اس لیے کروا رہا ہوں تاکہ اگر آپ کو کبھی ہماری ضرورت پڑے یا یاد آئے تو ''اولڈ مین'' کے بجائے ہمارے ناموں سے ہمیں یاد کریں۔ خیر! یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ آپ لوگوں سے پھر مل کے اچھا لگے گا۔''
احسان ملک نے خاور کو کارڈ تھمایا اور خدا حافظ کہہ کر دونوں اسٹیشن پہ اتر گئے۔ خاور نے کارڈ پہ نظر دوڑائی تو وہ ملک کی مشہور ''کمپنی'' کا تھا جس کے اونر احسان ملک تھے۔
کشمالہ اور خاور کے لیے یہ ایک اور دھچکا تھا۔ اپنی ''ذات'' میں اتنا کچھ ہونے والے، بظاہر کتنے سادہ اور پُرسکون تھے۔
بعض ''سفر'' صرف ''سفر'' ہی نہیں ہوتے بلکہ آنے والی زندگی کی نئی راہیں متعین کر دیتے ہیں جیسے کشمالہ اور خاور کے ساتھ ہوا

تھا۔ انہیں زندگی کے ''سفر'' کے لیے ''زادِراہ'' مل گیا تھا جو اُن کی تمام عمر کے لیے کافی تھا۔

(پہلا انعام: 120 روپے کی کتب)

معافی

(بشیر احمد، بھیر کنڈ، مانسہرہ)

''امی! آپ نے تو حد کر دی۔ ہر بات میں آپ عامر کو ہی اہمیت دیتی ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں؟'' شانی نے امی کی طرف دیکھا۔

''نہیں بیٹا! آپ کو ویسے ہی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو اپنے دونوں بیٹوں سے برابر پیار کرتی ہوں۔'' امی نے پیار سے سمجھایا۔

''تو پھر جب شام کو میں کھیلنے جا رہا تھا تو آپ نے مجھے منع کر دیا جب کہ عامر کو آپ نے جانے دیا۔'' شانی کا غصہ اترنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو چکا تھا۔

''دیکھو بیٹا!'' امی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''عامر آپ کا بڑا بھائی ہے۔ اسے عامر بھائی کہا کرو۔ تمہیں میں نے اس لیے نہیں جانے دیا کہ آپ کے پیپرز ہیں اور آپ کی بالکل تیاری نہیں ہے۔ آپ کی کئی بار اسکول سے شکایت بھی آ چکی ہے جب کہ عامر کی تیاری مکمل ہے۔'' ''اچھا!'' شانی نے سمجھنے والے انداز میں سر جھکا لیا لیکن اندر سے وہ عامر کے خلاف جل رہا تھا۔

''آنے دو! اس سے میں اچھی طرح نبٹتا ہوں۔'' یہ سوچتے ہوئے شانی اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ☆☆☆

''دیکھیں امی! ابو بھی آپ کی طرح عامر بھائی کو اہمیت دیتے ہیں۔'' شانی نے شکایتاً کہا۔ ''ابو نے اب میرے لاڈلے کو کیا کہا۔'' امی نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔

''سائیکل کا مطالبہ میں کر رہا تھا جب کہ ابو نے سائیکل عامر کو لا کر دے دی۔'' شانی نے امی کی نصیحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا! عامر بھائی اب نئے اسکول میں چلے گئے ہیں جو یہاں سے بہت دُور شہر میں ہے۔ روز روز کے کرایہ اور وقت کے ضیاع سے بچنے کے لیے میری کمیٹی کے پیسوں سے ابو نے عامر بھائی کو سائیکل لے کر دے دی تاکہ وہ اس پر اسکول آیا جایا کریں۔''

''مجھے بھی سائیکل چاہیے۔''

''آپ کا اسکول تو یہ سامنے گلی میں ہے۔ دو منٹ بھی نہیں لگتے اور ہمارے اخراجات بھی ہمیں اجازت نہیں دیتے لیکن میں کوشش کر کے آپ کو سائیکل لے دوں گی۔'' امی کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''مجھے اب ہر حال میں سائیکل لینی ہے۔ اس کے لیے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، ورنہ میں عامر سے ہار جاؤں گا۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ یہاں سے چل دیا۔ ☆☆☆

شانی کے پہنچنے سے پہلے عامر کمرے میں داخل ہوا جو ساری گفتگو سن چکا تھا۔ وہ شانی سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شانی نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے وہاں سے چل دیا۔

☆☆☆

شام کو عامر شانی کے کمرے میں موجود تھا اور شانی بستر میں اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ عامر نے اس کے منہ سے چادر ہٹائی تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جن میں آنسو تھے۔ عامر نے لمحے کے ہزارویں حصے میں ایک فیصلہ کیا۔ ''یہ سائیکل آپ کو مبارک ہو۔ مجھے ایسی سائیکل نہیں چاہیے جس سے میرے پیارے بھائی کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔'' ''کیا؟'' شانی کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔ اس کی دلی مراد جو پوری ہوئی تھی۔ ''ہاں! یہ سائیکل آپ کی ہوئی۔ میں پیدل ہی اسکول آیا جایا کروں گا۔''

''تو اس سے آپ کا ٹائم ضائع ہو گا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

''آپ کی خوشی کے لیے ٹائم کیا چیز ہے۔'' عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں میں آپ سے معافی بھی مانگتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔'' عامر وہاں سے چل دیا۔

''عامر بھائی!'' شانی نے اپنی آنکھیں کھولیں جو خوشی سے بند ہو چکی تھیں لیکن عامر وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا کیوں کہ اس کا سویا ہوا دماغ جاگ چکا تھا۔ ''عامر

بھائی! میں آپ سے اپنے روپے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں نے آپ کو بُرا بھلا کہا۔ آپ سائیکل پر ہی اسکول آیا جایا کریں، میں بعد میں سائیکل چلا کر اپنا شوق پورا کر لیا کروں گا۔'' یہ کہہ کر شانی وہاں نہیں رکا کیوں کہ اسے امی سے بھی معافی مانگنی تھی۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

صابن کی سلاد......!

(مریم فاروق، کراچی)

سب بچوں نے حسبِ معمول ارادہ کیا کہ صبح اتوار ہے لہٰذا دیر سے اٹھیں گے، لیکن امی نے ہمارا ارادہ یہ کہہ کر توڑ دیا کہ ''تم لوگوں کے کینیڈا والے ماموں فیملی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں، میں نے انہیں کل دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے لہٰذا تم لوگوں کو جلدی اٹھ کر کاموں میں مدد دینی ہے۔'' ماموں جان کے آنے کی تو ہمیں بہت خوشی ہوئی، مگر جلد اٹھنے کی شرط نے سارا مزہ کرکرا کر دیا......!

ابھی ہم خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ ہی رہے تھے کہ اچانک لحاف سر سے بلکہ پیر تک سے اٹھ گیا۔ وہ شفیق ہستی جسے ماں کہا جاتا ہے، ہمیں قہر بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ہم نے کہا۔ ''ابھی تو چھ بجے ہیں، اتنی بھی کیا جلدی ہے!'' امی نے کہا: ''یہ چھ نہیں نو ہیں۔ دو منٹ کے اندر بستر چھوڑ دو۔'' اب بڑی باجی ہونے کے ناتے ہماری ذمہ داری ٹھہری کہ اردگرد سوئے ہوئے بہن بھائیوں کو جگائیں اور اس مسافر خانے کو واپس ڈرائنگ روم میں تبدیل کریں۔

اس کام سے فراغت کے بعد ناشتے کا مرحلہ تھا۔ امی جلدی سے ناشتے نمٹانا چاہتی تھیں۔ ان کا آدھا ذہن کچن اور آدھا ہم کو ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ اتنے میں ماسی بھی نمودار ہو گئی جسے دیکھ کر امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہمارا ابھی آدھا ناشتہ ہی ہوا تھا کہ آگے سے پلیٹیں کھینچ لی گئیں۔ دراصل آج کام زیادہ ہونے کی وجہ سے امی نے ماسی کو جلد بلا لیا تھا۔ امی نے بدحواس ہو کر بچہ پارٹی کو جو ہدایات دینی شروع کیں وہ کچھ یوں تھیں۔ ''جاؤ جا کر فریج میں سے چادریں نکالو اور جلدی سے بچھاؤ، اور دیکھو ابو کے کُرتے ضرور تکیوں پر چڑھا دینا۔'' امی نے علی کے کان بھی مروڑے۔ ''اور دیکھو تم نے جو یہ بیٹ بال اور جوگرز پھیلا رکھے ہیں ان کو ہلکی آنچ پر اُبلنے کے لیے رکھو!''

اب امی کا رُخ ماسی کی طرف تھا، ارشاد ہوا۔ ''رضیہ! میں نے کل مشین میں کچھ کپڑے بھگو دیئے تھے۔ ان کو تہہ کر کے الماری میں رکھو۔ کچھ تو کام نمٹے۔'' اتنے میں امی کی نظر ابو پر پڑی جو اردگرد سے بے خبر اخبار پڑھ رہے تھے۔ ایک جھپٹا مار کر امی نے ان سے اخبار لے لیا اور ان کا ہدایت نامہ کچھ یوں تھا: ''میں نے کل احمد سے بریانی اور کوفتوں کا سامان منگوا لیا تھا لیکن سلاد اور میٹھا باقی ہے، اس لیے جلدی سے صابن اور پیراسیٹا مول لے آیئے۔'' یہ کہہ کر امی نے انہیں شاپر اور پیسے پکڑا دیے۔

ابو بھی زیرِ لب مسکرا رہے تھے اور میں اپنی ہنسی روک نہیں پا رہی تھی۔ امی میری طرف دیکھ کر بولیں۔ ''اب تم بھی کچھ کام میں مدد کرو گی یا نہیں! جاؤ کچن میں چاول رکھے ہیں، ان پر استری کرو۔'' میں نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آج تک استری چاولوں پر نہیں کی۔'' اتنے میں دیکھا ماسی بھی گیلے کپڑوں کو ہاتھ میں لیے چلی آ رہی ہے ''بیگم صاحبہ! آپ نے تو کبھی گیلے کپڑے الماری میں نہیں رکھوائے؟ اب کیا کروں؟'' ابو کی آواز آئی۔ ''سلاد کے لیے صابن اور پیراسیٹامول کچھ مناسب نہیں لگ رہے۔ کیا یہ نئی ترکیب کسی چینل سے سیکھی ہے؟''

اتنے میں زبردست قہقہوں کے ساتھ بھائی جان کمرے سے برآمد ہوئے اور امی جان کو سکون سے صوفے پر بٹھایا اور کہا۔ ''اس وقت امی کتنی Tension میں ہیں۔ امی جان! آپ فکر نہ کریں، ہم سب مل کر ابھی منٹوں میں سب کام درست طریقے سے کر دیں گے۔'' پھر بھائی جان نے ہم سب سے کہا۔ ''اگر صبح سب وقت پر اٹھ کر کام کر لیتے تو امی جان اتنی پریشان نہ ہوتیں۔ بہت ہنس لیے، چلو کام تقسیم کرتے ہیں، ابھی سب ہو جاتا ہے۔''

اس کے بعد واقعی ایسا ہوا کہ مہمانوں کے آنے سے پہلے گھر بھی سیٹ تھا، کھانا بھی تیار تھا اور امی بھی خوش تھیں۔ اب ہم ماموں جان کے ساتھ خوش گپیاں کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)

☆☆☆

ہوائی جہاز کے موجد

ولبر رائٹ اور اُروائل رائٹ

کیتھرین اپنے باپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مطالعے کے کمرے میں آگئی۔ دیکھا کہ ابا جان ایک کرسی پر بیٹھے کتاب پر جھکے ہوئے ہیں۔ کیتھرین دروازے ہی میں کھڑی ہوگئی اور بولی:

''ابا جان! ڈاک آگئی؟''

''ہاں!'' باپ نے کتاب پر جھکے ہوئے کہا۔

''ولبر اور اُروائل کا خط نہیں آیا؟''

''نہیں۔'' باپ نے جواب دیا اور کتاب سے نظریں اٹھا کر بولا۔''ابھی تک کوئی خط نہیں آیا۔''

کیتھرین باپ کے پاس آتے ہوئے بڑے دُکھ سے کہنے لگی: ''اب تو کرسمس بھی آگیا ابا جان! میرے بھائی کب آئیں گے؟''

''آجائیں گے بیٹی۔'' باپ نے کہا۔''تیرے بھائی بیکار نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ ہوا میں اُڑنے کی فکر میں ہیں۔ تیرے پاس اُڑ کر آجائیں گے۔''

ادھر کیتھرین بھائیوں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُدھر دونوں بھائی واقعی اُڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت اپنی اُڑان مشین لے کر کٹی ہاک کی ریت پر بیٹھے تھے۔

ولبر رائٹ اور اُروائل رائٹ دو بھائی امریکہ کے رہنے والے تھے۔ ولبر رائٹ انڈیانا میں اور اس کا چھوٹا بھائی اُروائل رائٹ اوہایو کے قصبے ڈے ٹن میں پیدا ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں کو بچپن میں پتنگ اُڑانے اور پرندے پکڑنے کا بڑا شوق تھا۔ پتنگ جب اُڑاتا تو وہ سوچتے کہ کاغذ کا بنا ہوا ذرا سا پتنگ ہوا میں کتنی دُور تک اُڑ جاتا ہے۔ وہ پرندے پکڑ پکڑ کر چھوڑ دیتے اور پھر انہیں اُڑتے دیکھ کر آپس میں کہتے۔''یار! اگر ہم بھی ان کی طرح اُڑنے لگیں تو کتنا مزہ آئے۔'' دونوں بھائیوں کو کتابیں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا لیکن کتابیں بھی ایسی تلاش کرتے جن میں اُڑنے کے متعلق کچھ لکھا ہوتا۔

چھوٹے بھائی اُروائل رائٹ کو اخبار پڑھنے کا بھی چسکا تھا۔ وہ چھوٹی عمر ہی میں ایک اخبار کا نامہ نگار بن گیا اور جب سترہ سال کا ہوا تو اس نے اپنا اخبار نکالا۔ وہ اپنے اخبار کا ایڈیٹر بھی تھا اور چھاپنے والا بھی۔ پھر اُروائل نے اپنے بڑے بھائی ولبر رائٹ کو اپنے پاس بلوا لیا اور اسے اخبار کا ایڈیٹر بنا دیا اور خود چھپائی کی دیکھ

بھال کرتا رہا۔ اخبار نکالنے کے دوران دونوں بھائیوں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اب بھی وہ ایسی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے جن میں ہوا میں اُڑنے کے متعلق لکھا ہوتا۔ انہی دنوں ایک جرمن انجینئر ہوا میں اُڑنے کے تجربے کر رہا تھا۔ دونوں بھائی اخباروں میں جرمن انجینئر کے تجربوں کا حال بڑی دلچسپی سے پڑھتے۔ جب وہ جرمن فوت ہو گیا تو دونوں بھائیوں نے سوچا کہ کیوں نہ وہ ہوا میں اُڑنے والی کوئی مشین ایجاد کرنے کی کوشش کریں۔

دونوں بھائیوں نے اخبار بند کر دیا۔ ان دنوں سائیکل نئے نئے چلے تھے۔ اس لیے بہت سے لوگ سائیکل خرید رہے تھے۔ اب ولبر اور اُروائل نے ڈے ٹن میں سائیکل سازی کا کام شروع کیا۔ اس سے انہیں دو فائدے ہوئے۔ ایک تو سائیکل بیچنے سے انہیں رقم مل جاتی، دوسرے انہیں ہوا میں اُڑنے کے لیے تجربے کرنے کا وقت مل جاتا۔ وہ سائیکل فروخت کرنے سے جتنا روپیہ کماتے سب کا سب اپنے تجربوں پر خرچ کر دیتے۔ اُڑنے کے لیے کوئی مشین تیار کر لینا آسان کام تو نہیں تھا لیکن دونوں بھائیوں کو تو ہوا میں اُڑنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ وہ جب سائیکلوں کی ساری آمدنی خرچ کر دیتے تو بالکل خالی ہاتھ رہ جاتے۔ اس حالت میں اپنی بہن کیتھرین کی منت خوشامد کرتے۔ کیتھرین ان دنوں ایک اسکول میں استانی تھی۔ وہ بیچاری اپنی تنخواہ میں سے بھائیوں کو روپے دے دیتی اور وہ دونوں پھر اُڑن مشین بنانے میں مصروف ہو جاتے۔ آخر ولبر اور اُروائل نے اپنی ورکشاپ میں چھوٹی سی اُڑن مشین تیار کر لی۔ اسے پٹرول سے چلانے کے لیے ایک موٹر بنائی۔ موٹر کو مشین کے ساتھ لگایا اور اس بے ڈول سے جہاز کو اُڑانے کے لیے اپنے گھر سے بہت دُور سمندر کے کنارے لے آئے۔ یہ جگہ کٹی ہاک کے نام سے مشہور ہے۔ وہ کٹی ہاک کی ریتلی زمین پر اُڑنے کا تجربہ کرنے آئے تھے۔ دونوں بھائیوں کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اسی لیے انہوں نے بہت سے لوگوں سے کہا کہ وہاں آ کر اُڑنے کا تماشا دیکھیں لیکن لوگوں نے دل میں کہا کہ ہم تمہاری طرح پاگل نہیں ہیں۔ اُڑنا پرندے کا کام ہے، انسان کے بس کی بات نہیں۔ انسان کوا، چڑیا یا طوطا تو ہے نہیں جو اُڑنے لگے اور اگر انسان اُڑنے کے قابل ہوتا تو کیا اللہ میاں بازوؤں کی جگہ اس کے پَر نہ لگا دیتے؟

صبح کے وقت سخت سردی پڑ رہی تھی۔ لوگ ابھی تک اپنے بستروں میں گھسے ہوئے تھے۔ ہوا زور زور سے چل رہی تھی۔ ایک تو زور کی ہوا، سخت سردی اور اوپر سے سمندر کا کنارہ۔ سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں اور اس وقت ہزاروں لاکھوں لوگوں میں سے صرف پانچ آدمی ولبر اور اس کے بھائی کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی سردی سے کانپتے ہوئے بولا۔ ''ارے میاں! جانے دو۔ ہوا بہت تیز ہے۔ سردی بھی بہت ہے۔''

اور ولبر رائٹ نے جواب دیا۔ ''میرے بھائی! تیز ہوا، شدید سردی یا طوفان ہمیں اُڑنے سے نہیں روک سکتا۔''

اب سوال یہ تھا کہ دونوں بھائیوں میں سے پہلے کون اُڑے گا۔ دونوں نے مشورہ کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ ''ٹاس'' کر لیا جائے۔ چنانچہ ''ٹاس'' ہوا۔ چھوٹا بھائی جیت گیا۔ اُروائل چھوٹے سے جہاز پر بیٹھ گیا اور ولبر اسے لکڑی کی پٹڑی پر دھکیلنے لگا۔ یہ جہاز پٹڑی پر چلا۔ دوڑنے لگا اور پھر ہوا میں اونچا اُٹھ گیا۔ ولبر نے اسے چھوڑ دیا۔ ولبر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خدانخواستہ اس کے بھائی کو کچھ ہو گیا تو...... جہاز ایک سو فٹ اونچا گیا اور بارہ سیکنڈ کے بعد نیچے ریت پر گر گیا۔ ولبر بھاگا بھاگا گیا اور بھائی کو آواز دی۔

''اُروائل، اُروائل! خیریت ہے نا۔''

''ہاں!'' اُروائل نے جواب دیا اور اُڑن مشین کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اُروائل باہر آ کر بولا۔ ''اب آپ کی باری ہے۔''

ولبر رائٹ جہاز میں بیٹھا اور 59 سیکنڈ تک اُڑن مشین کے ساتھ ہوا میں اُڑتا رہا۔ اس نے 812 فٹ کا فاصلہ طے کیا۔ ولبر باہر نکلا تو دونوں بھائی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ مارے خوشی کے ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکلتے تھے۔ پانچوں تماشائی بھاگے بھاگے آئے اور دونوں بھائیوں کے ہاتھ چومنے لگے۔ ''خدا کی قسم! کمال کر دیا۔'' وہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''ہم نے زندگی میں آج تک ایسا تماشا نہیں دیکھا۔ نہ اس کے متعلق کبھی سنا ہی ہے۔'' ایک

آدمی نے سمندر کے اوپر اُڑتے ہوئے سفید بگلوں کو دیکھا اور ان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"تم دونوں بھائی ان پرندوں سے بھی اونچا اُڑو گے۔"

انسان کی تاریخ میں اتنا بڑا کارنامہ آج تک نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے سنا تو بہت حیران ہوئے۔ "ارے بھائی کیا انسان کو بھی پَر لگ گئے ہیں؟" لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے اور ادھر گھر میں بیٹھی ہوئی کیتھرین کو جب بھائیوں کا خط ملا تو وہ اس قدر خوش ہوئی کہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ بے اختیار بولی۔ "ابا جان میرے بھائی واقعی اُڑنے لگے ہیں۔ آپ نے سچ کہا تھا۔" اور باپ بولا۔ "مجھے اپنے بیٹوں پر فخر ہے۔" دونوں بھائی کرسمس منانے کے لیے گھر پہنچے تو بہت خوشیاں منائی گئیں۔

ولبر اور اُروائل رائٹ اپنی کامیابی پر خوش ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ اب انہوں نے پہلے سے زیادہ طاقت ور اُڑن مشین بنانا شروع کی۔ مشین تیار ہو گئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کٹی ہاک ان کے قصبے ڈے ٹن سے بہت دُور ہے، اس لیے تجربہ کرنے کے لیے کوئی نزدیک جگہ تلاش کی جائے۔ ڈے ٹن سے آٹھ میل دُور ایک کھلی جگہ ڈھونڈ لی گئی اور دونوں بھائی تجربہ کرنے یہاں آ گئے۔

ان کی پہلی کامیابی کا بہت کم لوگوں کو علم ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے کچھ اخبار نویسوں کو بلوایا۔ ان کا خیال تھا کہ اخبار والے ان کی کامیابی دیکھ کر اخباروں میں لکھیں گے اور اس طرح سب لوگوں کو پتا چل جائے گا۔ بہت سے اخبار نویس یہ تماشا دیکھنے کے لیے آئے لیکن تجربہ نہ ہوا۔ ایک تو ہوا بہت زور کی تھی، دوسرے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی۔ ولبر اور اُروائل سخت شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے اخبار والوں سے کہا کہ جناب آج تو تجربہ نہیں ہو سکا، کل ہو گا اس لیے آپ کل ضرور تشریف لائیے۔ اگلے دن بہت کم اخبار نویس آئے لیکن انہیں آج بھی کچھ دکھائی نہ دیا۔ آج پھر انجن خراب ہو گیا تھا۔ اس بات کا دونوں بھائیوں کو بڑا دُکھ ہوا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ پہلے ہی لوگ ان کے ہوا میں اُڑانے کا مذاق سمجھتے ہیں، اب تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔

دونوں بھائی مایوس ہو کر ڈے ٹن آئے اور آتے ہی کام میں لگ گئے۔ اب انہوں نے بڑا اچھا انجن تیار کر لیا۔ وہ کافی دُور تک اُڑے۔ پھر اُڑنے کا فاصلہ اور وقت بڑھتا گیا اور وہ ایک میل سے زیادہ اُڑنے لگے۔

اب انہوں نے تجربے بند کر دیے اور ہوا میں اُڑنے کے طریقوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ انہوں نے اپنا سارا وقت اور تمام روپیہ اسی مطالعے میں لگا دیا۔ انہوں نے سائیکلوں کی ورکشاپ بھی بند کر دی۔ اس عرصے میں یورپ میں کئی اور لوگوں نے بھی اُڑنے کے تجربے کیے۔ بڑا بھائی ولبر رائٹ فرانس چلا گیا۔ اس کے تجربے دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ وہ لوگ ولبر کے تجربے اور اس کی سادگی دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ ولبر کے پاس کام کرنے کے لیے ایک معمولی سی میز اور کرسی تھی۔ ایک چھوٹی چارپائی تھی جس پر رات کو وہ تھک کر سو جاتا تھا۔ فرانس میں ولبر ایک افسر کو ساتھ بٹھا کر ہوا میں اُڑا اور ایک گھنٹے چار منٹ تک برابر اُڑتا رہا۔

چھوٹا بھائی اُروائل امریکہ ہی میں تھا لیکن وہ بھی اُڑنے کے تجربے کرتا رہا۔ ایک دفعہ اس کے جہاز کو سخت حادثہ پیش آیا۔ اُروائل رائٹ ایک فوجی افسر کو ساتھ بٹھا کر اُڑ رہا تھا کہ جہاز نیچے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اُروائل سخت زخمی ہو گیا۔ اُس کی جان تو بچ گئی لیکن فوجی افسر مر گیا۔

دونوں بھائی مشہور ہو گئے تو ایک کمپنی نے ان کی مدد سے ہوائی جہاز بنانے شروع کیے۔ اس سے دونوں بھائی امیر ہو گئے اور مزے سے زندگی گزارنے لگے۔ اب انہوں نے اُڑنا بند کر دیا اور ہوائی جہاز بنانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کو اُڑنا بھی سکھاتے۔ ایک روز ولبر رائٹ کو بخار ہو گیا اور اس بخار نے اس کی جان لے لی۔ چھوٹے بھائی کو اس موت کا بہت دُکھ ہوا۔ اس کا بڑا بھائی ہی نہیں مرا تھا، بلکہ ایک اچھا ساتھی اور بہترین دوست ہمیشہ کے لیے چھن گیا تھا۔ اُروائل بھائی کی موت سے بہت اُداس رہنے لگا لیکن اس حالت میں بھی اسے 17 دسمبر 1903ء کا وہ بے حد ٹھنڈا دن یاد رہا جو اس نے اپنے بھائی کے ساتھ گزارا تھا۔ یہ وہ دن ہے جو انسان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

س	ط	گ	ط	و	ط	ا	ب	ف	ل
و	ف	ش	ء	ل	ی	چ	ک	س	ل
ح	ا	ک	ن	م	غ	ژ	ل	ح	ی
ز	خ	ک	ب	و	ت	ر	ب	ص	ب
د	ت	ی	ر	ط	ع	ش	ل	و	ا
ہ	ہ	چ	ڈ	م	ے	ف	ب	ی	ب
د	ف	ا	ے	ڑ	چ	ن	و	ک	ا
ہ	گ	س	ح	ذ	ج	ٹ	ج	م	غ
ش	ف	ض	ی	ا	ک	م	ی	ن	ا
ن	پ	ب	ا	ق	ع	ظ	خ	ٹ	چ

آپ نے حروف ملا کر پرندوں کے دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن پرندوں کے ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

چیل، کبوتر، فاختہ، بلبل، چڑیا، ہدہد، مینا، ابابیل، عقاب، طوطا

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ڈیئر اڈیٹر! آپ کا کیا حال ہے؟ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ جون کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میں نے تقریباً 20 کے قریب تحریریں بھیجی ہیں لیکن ایک بھی شائع نہیں ہوئی اور نہ ہی بتایا گیا ہے۔
(شکیل الرحمٰن، شرق پور شریف)

☆ ہمیں آپ کی صرف ایک تحریر ملی ہے، جو باری آنے پر شائع کر دی جائے گی۔

میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہوں اور پہلی جماعت سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ جون کا شمارہ زبردست تھا۔ میں تعلیم و تربیت کی ممبر بننا چاہتی ہوں۔
(رداء چوہدری، راولپنڈی)

☆ ممبر بننے کے لیے سرکولیشن مینیجر سے رابطہ کریں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں 6 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ جون کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ چچا تیز گام اور سوال کہانی بہت اچھی لگی۔
(عبداللہ طارق، ای میل)

جون کے شمارے میں سوال، ادھوری زندگی پسند آئیں۔ میرا خط ضرور شامل کریں ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔
(محمد عمار صدیق، کراچی)

جون کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ تمام کہانیاں شان دار تھیں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے شامل ہوگا۔
(حافظہ نمرہ رمضان)

میرا خط شامل کرنے کا شکریہ۔ میں نے بہت سی کہانیاں بھیجی ہیں۔ مہربانی فرما کر بتا دیں کہ شائع ہوں گی یا نہیں۔
(زائش خورشید، خلیل زئی، نواں شہر)

زائش! آپ کی کہانیاں ناقابلِ اشاعت ہیں۔ مزید تحریریں بھیجیں۔

معیاری ہوں گی تو ضرور شائع کریں گے۔

جون کا شمارہ بہت پسند آیا۔ سرورق اچھا تھا۔ ادھوری زندگی، نانی ٹخو، تھامس الوا ایڈیسن اور جنگل بہت پسند آئیں۔
(زنیرا شکیل، علی پور چٹھہ)

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ میرے امتحان ہو رہے ہیں دُعا کیجیے گا۔ ہم سب گھر والے بہت شوق سے یہ رسالہ پڑھتے ہیں، اس رسالے سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔
(نیہا فرید، سیالکوٹ)

السلام علیکم میں دو سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں جون کا شمارہ باقی شماروں کی طرح لاجواب تھا۔
(سید احسن، اسلام آباد ای میل)

جون کا شمارہ بہت پسند آیا۔ مئی کے شمارے کے لیے ایک کہانی بھیجی تھی۔ کیا وہ باری آنے پر شائع ہوگی۔
(وانیا نثار، لاہور)

آپ کی کہانی ناقابلِ اشاعت ہے۔ لہٰذا مزید کوشش کریں اور اچھی سی تحریر لکھ کر بھیجیں۔ مکمل پتا ضرور لکھیے۔

میں پندرہ ماہ سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں ہر شمارے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو ترقی دے۔ (آمین)
(محمد آویز ساجد، وہوا)

مجھے تعلیم و تربیت دل و جان سے پیارا ہے۔ میں چھ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ تین بار تین ہفتوں کی محنت سے تحریر لکھ کر بھیجی ہے۔ ناول نیلی روشنی کی پہلی قسط نے دل جیت لیا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔
(کشف طاہر، لاہور)

☆ آپ کی تحریر باری آنے پر ضرور شائع ہوگی۔ مایوس مت ہوں۔

جون کا شمارہ جونہی کھولا تو اپنے پسندیدہ مصنفین کی کہانیاں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تھامس الوا ایڈیسن پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا آپ سے فرمائش ہے کہ مرحوم مصنفین کی کہانیاں بھی دوبارہ شائع کریں۔ کہانیاں نانی ٹخو، جنگل، چچا تیز گام اور سوال بہت پسند آئیں۔
(ام حبیبہ، نکودر)

جون کا شمارہ بہت پسند آیا۔ سوال، ادھوری زندگی، نانی ٹخو بہت اچھی تھیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ ضرور شائع کریں۔
(رانا شہروز، فیصل آباد)

میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں اسے ردی کی ٹوکری میں مت ڈالیے گا۔ جون کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ناول نیلی روشنی کا راز بہت اچھا ہے۔
(عائشہ شاہد، اسلام آباد)

میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس رسالے میں ہر ماہ نئی نئی سبق آموز کہانیاں پڑھ کر بہت لطف آتا ہے۔ جو ذہنی صلاحیتوں کو نکھارتی ہیں۔ جون کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔
(صدف امین، لاہور)

☆ صدف! انعام قرعہ اندازی کے ذریعے دیے جاتے ہیں لہٰذا انتظار کی زحمت تو آپ کو اٹھانا پڑے گی۔ آپ مزید تحریریں بھیجیں۔ باری آنے پر ضرور شائع کی جائیں گی۔

تعلیم و تربیت سے ہمارے گھر کا تعلق بہت پرانا ہے۔ میری خالہ اور ماموں بھی یہ رسالہ پڑھتے تھے۔ اور اب تک پڑھ رہے ہیں۔ اس میں تمام کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔ معلومات عامہ، دماغ لڑاؤ، بوجھو تو جانیں سب بہت مفید ہیں۔
(علیحا عمر، لاہور)

☆ علیحا! تعریف کا شکریہ۔ ہمیں آپ کی مثبت تنقید اور تجاویز کا بھی انتظار رہے گا۔ تمام سلسلوں میں حصہ لیجیے۔

میں تعلیم و تربیت بچپن سے پڑھتی آ رہی ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ شمارہ ہے۔ ہر کہانی دل چسپ ہوتی ہے پڑھنے کا بہت مزہ آتا ہے کیا انوکھی دنیا ناول ختم کر دیا ہے؟
(حمنہ عارف، لاہور)

☆ انوکھی دنیا ناول ختم کر دیا گیا ہے۔ اب آپ کے لیے ایک دل چسپ ناول ''نیلی روشنی کا راز'' شروع کیا گیا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ مسلسل 5 سال رسالہ پڑھنے کے بعد پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔
(محمد سفیان، جھنگ)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اپنی تحریریں بھیجیں اور تجاویز بھی۔

میں نے آپ کو پچھلے ماہ بھی خط لکھا تھا لیکن شائع نہیں ہوا۔ شاید آپ صرف تعریفوں والے خطوط ہی شائع کرتے ہیں شکایتوں والے نہیں۔ جون میں میری سال گرہ ہے۔
(مومنہ احسن، فیصل آباد)

☆ آپ کو سال گرہ مبارک ہو۔ آپ کی فرمائش جلد پوری کریں گے۔

کیسے ہیں آپ؟ جون کا شمارہ پسند آیا تمام کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ سوال، نانی ٹخو، جنگل اور چچا تیز گام بہت پسند آئیں۔ ناول نیلی روشنی کا راز ٹاپ پر ہے۔
(محمد حذیفہ زبیر، چکسواری)

جون کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ڈرتے ڈرتے پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ پلیز شائع کر دیجیے گا۔ سوال، ادھوری زندگی اور نمکین سیر پڑھ کر بہت مزا آیا۔
(کنزہ عبدالقدیر، قلعہ دیدار سنگھ)

پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ نیلی روشنی کا راز، بڑھا کے دکھا، حلوے کی بچت، چچا تیز گام اور جنگل بہترین کہانیاں تھیں۔ میرا خط ضرور شامل کریں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ترقی عطا فرمائے۔ آمین
(حمنہ میر، جہلم)

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ کھوج لگائیے، بلاعنوان، آیئے عہد کریں تعلیم و تربیت کی جان ہیں۔
(معاذ قدیر، منڈی بہاؤالدین)

میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں نانی ٹخو، بڑھا کے دکھا ٹاپ پر تھیں۔ کیا میں عید کے موضوع پر نظم بھیج سکتا ہوں۔
(دانش علی دانشی، فاروق آباد)

☆ آپ نظم کے علاوہ دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیجیے۔ نظم معیاری ہوئی تو ضرور شائع ہو گی۔

اپریل اور جون کا شمارہ نہیں ملا۔ اس لیے میں تعلیم و تربیت کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔
(زین العابدین شاہ، رحیم یار خان)

☆ خریدار بننے کے لیے سرکولیشن مینیجر سے رابطہ کریں۔

جون کا شمارہ باقی شماروں سے بازی لے گیا ہے۔ تھامس الوا ایڈیسن پڑھ کر سائنسی تعلیم سے مزید رغبت بڑھی۔ نانی ٹخو پڑھ کر قہقہوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ نیلی روشنی کا راز بہت اچھا ناول ہے۔ آپ بھی لکھیے میں تمام کہانیاں اعلیٰ تھیں۔ پاکستانی بچے بہت ذہین اور قابل ہیں۔
(تیمیہ حسین، اسلام آباد)

جون کا شمارہ بہت پسند آیا۔ سوال، تھامس الوا ایڈیسن اور نیلی روشنی کا راز بہت پسند آئیں۔
(صفا رشید، کراچی)

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں تعلیم و تربیت 6 سال سے پڑھ رہا ہوں۔ جون کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سوال اور چچا تیز گام کہانیاں بہت اچھی لگیں۔
(عبداللہ طارق، ای میل)

میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ تحریر بھیج رہی ہوں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کیجیے گا۔
(مریم رؤف، گوجرانوالہ)
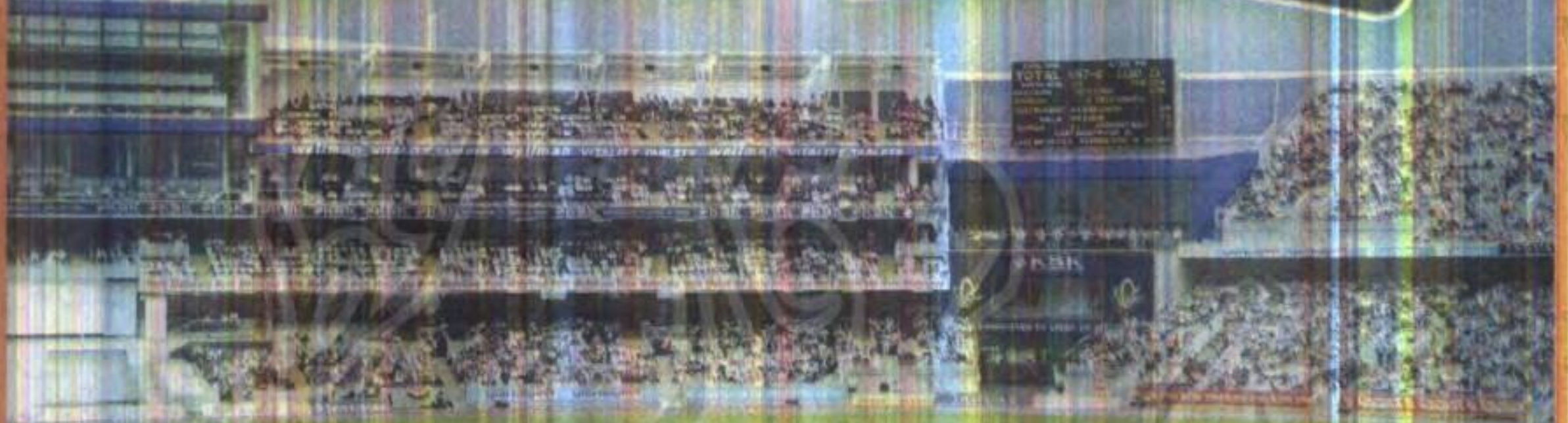
نسرین شاہین

بیٹ کیری کرنے والے کھلاڑی

ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں اب تک بے شمار ریکارڈ بنے اور ٹوٹے ہیں۔ یہ ریکارڈ بیٹنگ میں بھی بنے اور بولنگ میں بھی۔ بعض ریکارڈ تو ایسے بھی تھے جو بظاہر ناممکن نظر آتے تھے مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی اور اس کا عملی مظاہرہ کرکٹ کے میدانوں میں دیکھنے میں آتا رہا۔ بہت مشکل اور سخت قسم کے ریکارڈ بنے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹوٹ بھی گئے۔ کرکٹ کی دنیا ایک حیرت انگیز دنیا ہے جس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا ہو جائے، صرف ایک گیند یا صرف ایک رنز سے بڑی فتح شکست میں یا بظاہر شکست فتح میں بدل جاتی ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع ”بیٹ کیری“ کا کارنامہ انجام دینے والے کھلاڑی ہیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو ہر کسی ٹیسٹ کرکٹر کا مقدر نہیں بنتا۔ مجموعی طور پر چار پاکستانی بیٹسمینوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ نذر محمد، مدثر نذر، سعید انور اور عمران فرحت۔ آیئے! ایک نظر ان کھلاڑیوں کی کارکردگی پر ڈالتے ہیں کہ یہ کارنامہ انہوں نے کب اور کس ملک کے خلاف انجام دیا۔

☆ نذر محمد نے 16 اکتوبر 1952ء کو دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ میں کھیلے جانے والے پہلے ٹیسٹ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس ٹیسٹ میچ میں پاکستان کی جانب سے پہلا کیچ لینے کا اعزاز نذر محمد کو حاصل ہوا۔ انہوں نے بھارتی بیٹسمین وجے منجریکر کو امیر الٰہی کی گیند پر کیچ آؤٹ کیا۔ پاکستان کی جانب سے ٹیسٹ کرکٹ میں رن اسکور کرنے کا اعزاز نذر محمد کو حاصل ہوا۔ بھارت نے یہ ٹیسٹ میچ صرف تین دن میں ایک اننگز اور 70 رنز سے جیت لیا۔ دوسرے ٹیسٹ میں اوپنر نذر محمد نے انتہائی شان دار بیٹنگ کا مظاہرہ کیا اور اپنے ملک کی طرف سے ٹیسٹ میچوں میں پہلی سنچری اسکور کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ نذر محمد 124 رنز پر ناٹ آؤٹ رہے۔ وہ ٹیسٹ کرکٹ میں ”بیٹ کیری“ کرنے والے پہلے پاکستانی بیٹسمین تھے۔ اس طرح تمام پلیئرز کے آؤٹ ہونے کے بعد ناقابل شکست پویلین واپس آنے والے پہلے پاکستانی اوپنر نذر محمد بنے۔ لکھنؤ ٹیسٹ میں نذر محمد نے ایک اور اعزاز حاصل کیا۔ وہ ٹیسٹ کرکٹ میں کسی ٹیسٹ میچ کے دوران تمام وقت فیلڈ میں

موجود رہنے والے دنیائے کرکٹ کے پہلے ٹیسٹ کرکٹر ہیں۔

☆ مدثر نذر نے اپنے والد نذر محمد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے 1983ء میں ''بیٹ کیری'' کیا۔ انہوں نے بھارت کے خلاف 152 کی اننگز کھیلی جس کی بدولت ٹیم 323 رنز بنانے میں کامیاب رہی۔ مدثر نذر نے یہ کارنامہ لاہور میں انجام دیا۔ وہ شروع سے آخر تک کھیلتے رہے حالانکہ اس میچ میں کپل دیو چھائے ہوئے تھے اور انہوں نے 85 رنز دے کر 8 وکٹیں لی تھیں۔ اس طرح مدثر نذر بیٹ کیری کرنے والے پاکستان کے دوسرے کھلاڑی بن گئے۔ پاکستان کی جانب سے کسی ایک مکمل ٹیسٹ اننگز میں بیٹ کیری کرنے کا کارنامہ اب تک چار کھلاڑیوں نے انجام دیا ہے۔ اتفاق سے ان میں دو کھلاڑی آپس میں باپ بیٹے ہیں، نذر محمد اور مدثر نذر۔ اس طرح ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں کسی باپ اور بیٹے کی جانب سے بیٹ کیری کرنے کا کارنامہ واحد مثال ہے اور ایک انوکھا ریکارڈ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں باپ بیٹا نے یہ کارنامہ بھارت کے خلاف انجام دیا۔

☆ سعید انور نے 1999ء میں بھارت کے خلاف 188 رنز ناٹ آؤٹ بنا کر پاکستان کا اسکور 316 تک پہنچایا تھا۔ سعید انور اوپنر بیٹسمین تھے۔ انہوں نے ون ڈے انٹرنیشنل کرکٹ میں سب سے بڑی اننگز کھیلنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا، جب انہوں نے 97-1996ء میں بھارت کے شہر چنائے (مدراس) میں آزادی کپ کے ایک میچ میں بھارت کے خلاف 194 رنز بنائے تھے۔ اس کے علاوہ سعید انور نے اپنی 194 رنز کی سب سے بڑی اننگز کے دوران 22 چوکے لگائے جو کسی بھی ون ڈے انٹرنیشنل کے دوران اننگز میں سب سے زیادہ چوکوں کا ریکارڈ ہے، جب کہ ٹیسٹ کرکٹ میں سعید انور کا منفرد ریکارڈ بیٹ کیری ہے۔ یوں سعید انور 1999ء میں بھارت کے خلاف کھیلے گئے میچ میں تیسرے پاکستانی بیٹسمین بن گئے جو بیٹ کیری کرنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔

☆ عمران فرحت نے نیوزی لینڈ کے خلاف نیپئر ٹیسٹ کی پہلی اننگز میں 117 رنز اسکور کر کے ٹیم کا مجموعی اسکور 223 رنز تک پہنچایا اور ناٹ آؤٹ رہے۔ بائیں ہاتھ کے بیٹسمین عمران فرحت 20 مئی 1982ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ایک اسپورٹس لورز فیملی میں جنم لینے کے باعث عمران فرحت کے شارٹس خوب صورتی لیے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کا اسٹائلش انداز ان کی خصوصیت تھی۔ بچپن میں بیڈمنٹن کھیلنے والے عمران فرحت نے اپنی ابتدائی تعلیم ڈویژن پبلک اسکول (DPS) ماڈل ٹاؤن لاہور سے حاصل کی، اس دوران میں بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے کیوں کہ ان کے والد فرحت حسین خود بیڈمنٹن کے معروف کھلاڑی اور کوچ تھے۔ انہیں دیکھ کر عمران فرحت کو بھی بیڈمنٹن کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔ عمران فرحت نے اسکول کی سطح پر بیڈمنٹن کے تمام ٹورنامنٹس میں کامیابیاں حاصل کیں اور کئی ایوارڈز بھی اپنے نام کیے۔ انھوں نے قومی چیمپئن واجد علی کے ہمراہ بیڈمنٹن ڈبل کا قومی جونیئر ٹورنامنٹ جیتا۔ وہ انڈر 14 اور انڈر 16 بیڈمنٹن چیمپئن بھی رہے۔ بعد ازاں اپنے والد کی خواہش پر بیڈمنٹن کو الوداع کہہ کر کرکٹ کی طرف آ گئے تھے، اور پہلی مرتبہ فضل محمود کوچنگ کلینک باغ جناح سے کرکٹ کھیلنی شروع کر دی اور خوب محنت کی۔ عمران فرحت کے ساتھ ان کے بڑے بھائی ہمایوں فرحت جو کہ بیس بال کھیلا کرتے تھے، انہوں نے بھی اسے خیرباد کہہ کر کرکٹ کھیلنا شروع کر دی تھی۔

1996ء میں انگلینڈ میں کھیلے گئے لومبارڈ انڈر 15 ورلڈ کپ کے لیے پاکستان انڈر 15 کرکٹ ٹیم کے ریزرو پلیئرز میں عمران فرحت کو جگہ مل گئی، پھر اپنی پرفارمنس کی بدولت 1998ء میں سری لنکا میں منعقدہ انڈر 19 ورلڈ کپ سمیت کئی ٹورنامنٹس میں پاکستان جونیئر ٹیم کی طرف سے عمدہ کارکردگی دکھا کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز مسلم جم خانہ کرکٹ کلب منٹو پارک سے کھیلتے ہوئے کیا۔ پھر ایل سی سی اے کرکٹ گراؤنڈ میں شائننگ کرکٹ کلب کو جوائن کر لیا۔ ڈومیسٹک کرکٹ میں بھی عمدہ پرفارمنس دکھائی جس کے نتیجے میں پاکستانی ٹیم میں شمولیت ملی اور انہیں اننگز کا آغاز سعید انور کے ساتھ ملا۔ عمران فرحت نے 2009ء میں بیٹ کیری کیا اور چوتھے پاکستانی اوپنر بیٹسمین بنے۔

عمران فرحت کی ٹیسٹ کرکٹ میں مجموعی طور پر بیٹ کیری کا 46 واں موقع بنا۔ اب تک آسٹریلیا 12، انگلینڈ 8، ویسٹ انڈیز

6، جنوبی افریقہ 5، پاکستان 4، سری لنکا اور بھارت 3،3 زمبابوے اور نیوزی لینڈ 2،2 جب کہ بنگلہ دیش ایک بار اس اعزاز کو پانے میں کام یاب رہا۔

ورلڈ کپ مقابلوں میں 7 بلے بازوں نے بیٹ کیری کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ سب سے پہلے 1975ء کے ورلڈ کپ میں بھارت کے سنیل گواسکر نے لارڈز کے مقام پر انگلینڈ کے خلاف اوپننگ کی اور آخر تک ناٹ آؤٹ رہے۔ انہوں نے 174 گیندیں کھیلیں اور 36 رنز بنائے۔ اسی ورلڈ کپ میں نیوزی لینڈ کے بیٹسمین گلین ٹرنر نے 171 رنز ایسٹ افریقہ کے خلاف ایجبسٹن میں بنائے اور بیٹ کیری کیا۔ 1987ء میں چندی گڑھ میں آسٹریلیا کے جیف مارش نے نیوزی لینڈ کے خلاف 126 رنز بنائے اور بیٹ کیری کیا۔ 1992ء میں دو بیٹسمینوں نے بیٹ کیری کا اعزاز حاصل کیا۔ پہلے زمبابوے کے اینڈ فلاور نے سری لنکا کے خلاف ہنائی مونتھ میں 115 رنز بنائے پھر پاکستان کے رمیض راجہ نے بھی اسی ورلڈ کپ میں میلبورن میں ویسٹ انڈیز کے خلاف 102 رنز بنا کر بیٹ کیری کیا۔ 1996ء کے ورلڈ کپ میں گیری کرسٹن نے 188 رنز کی ناقابل شکست اننگز کھیل کر راولپنڈی میں یو اے ای کی ٹیم کے خلاف بیٹ کیری کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1999ء کے ورلڈ کپ میں زمبابوے کے نیل جانسن نے آسٹریلیا کے خلاف لارڈز کے مقام پر 132 رنز بنائے اور بیٹ کیری کیا۔

☆☆☆

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح

تحریکِ پاکستان میں جہاں مردوں نے جوش اور ولولے کے ساتھ حصہ لیا وہیں خواتین بھی ان سے پیچھے نہ رہیں۔ قائداعظم کی بیوی رتی جناح اور بہن فاطمہ جناح تحریکِ پاکستان میں ان کے شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ بیگم شاہ نواز، بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم سلمیٰ تصدق، بیگم ہدایت اللہ، بیگم رعنا لیاقت علی خان، بیگم زینب خاتون اور ان جیسی بے شمار نام ور اور بے نام خواتین ایسی ہیں جنھوں نے بھرپور لگن اور محنت سے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ مادرِ ملت کا خطاب پانے والی محترمہ فاطمہ جناح 3 جولائی 1891ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے جونیئر کیمبرج کے بعد سینٹ پیٹرک ہائی اسکول کھنڈالا سے 1913ء میں سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ 1919ء میں آپ نے ڈینٹل کالج کلکتہ سے دانتوں کے ڈاکٹر (ڈینٹسٹ) کی ڈگری حاصل کی۔ قائداعظم ہر اتوار کو محترمہ فاطمہ جناح سے ملنے ڈینٹل کالج کلکتہ جاتے تھے۔ آپ نے 1923ء میں عبدالرحمن اسٹریٹ بمبئی میں اپنا ڈینٹل کلینک کھولا۔ تحریکِ پاکستان میں جس خاتون کا کردار آخری وقت تک قائداعظم کے ساتھ نظر آتا ہے وہ محترمہ فاطمہ جناح ہیں۔ قائداعظم کی سب سے قابلِ اعتماد ساتھی جنھوں نے قائداعظم کی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنے حسنِ تدبیر سے ان کو گھریلو ذمہ داریوں کی فکر سے بھی بچائے رکھا۔ آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف قائداعظم اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔ انگلستان میں کوئی کانفرنس ہو یا ہندوستان میں کوئی جلسہ، محترمہ فاطمہ جناح ہر مشکل وقت میں قائداعظم کی ہمت بندھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ عمر میں قائداعظم سے چھوٹی تھیں لیکن بعض اوقات قائداعظم کو مشورے دیتے وقت بڑی بہن کا کردار ادا کرتیں۔ 3 جون 1948ء کو قائداعظم نے ریڈیو سے قیامِ پاکستان کا اعلان کیا۔ 4 جون کو خواتین کا ایک جمِ غفیر قائداعظم کا خیر مقدم کرنے کے لیے جمع تھا۔ یہاں اتنی خواتین کو اکٹھا کرنے کا کام محترمہ فاطمہ جناح کا تھا۔

جب قائداعظم نے 1948ء میں مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو آپ ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ اس کے بعد جب قائداعظم بیمار ہو کر زیارت میں مقیم تھے تو صبح و شام ان کی تیمارداری کے فرائض انجام دینے والی کوئی اور ہستی نہیں بلکہ فاطمہ جناح تھیں۔ قائداعظم کی وفات کے بعد آپ کو اکیلے ہی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے بیانات سے قوم کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ آپ نے ملک بھر میں اپوزیشن کے انتخابی امیدوار کی حیثیت سے دورے کیے اور 1964ء میں صدر ایوب کے مقابلے میں صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ بڑے بڑے جلوس اور اجتماعات اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ قوم فاطمہ جناح سے کتنی عقیدت اور محبت رکھتی ہے۔ مادرِ ملت کا خطاب پانے والی آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے اور تاابد زندہ رہے گی۔ پاکستان بنانے میں محترمہ فاطمہ جناح کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ قدم قدم پر انہوں نے جس طرح قائداعظم کا ساتھ دیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح 9 جولائی 1967ء کو اس دُنیا سے رخصت ہوئیں۔

اُڑن طشتری

نسرین نکہت سبزواری

حسبِ معمول آج بھی شاذب علی الصبح سیر کے لیے گھر سے نکل گیا۔ اس کا گھر لاہور شہر کے بیچوں بیچ بہتی ہوئی خوب صورت نہر سے زیادہ دُور نہیں تھا، اس لیے وہ ہر روز صبح کی سیر کے لیے اسی طرف آ جاتا تھا۔ نہر کے دونوں طرف سفیدے، پاپلر اور دوسرے بہت سے درخت ہیں۔ ان میں سے کافی پھول دار بھی ہیں۔ بہار کے موسم میں یا برسات کے دنوں میں جب تمام درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں اور پھولوں سے بھر جاتے ہیں تو نہر کا منظر بہت خوب صورت ہو جاتا ہے۔ نہر کے پانی میں پھولوں کا عکس علامہ اقبال کے خوب صورت شعر کی یاد دلاتا ہے۔

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

لیکن پچھلے چند سالوں سے نہر کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ نہر کے کنارے بہت سے درخت طوفانِ باد و باراں کی نذر ہو گئے ہیں یا پھر انہیں ایندھن کے لیے کاٹ ڈالا گیا ہے، جب کہ نئے درخت بہت کم لگائے گئے ہیں۔ جب نہر کے کنارے بے ہنگم بڑھتے ہوئے ٹریفک کی وجہ سے سڑکوں کی چوڑائی بڑھائی جاتی ہے تو شامت بے چارے درختوں کی آتی ہے جو ایک طرف تو اپنی دلکش اور شادابی سے شہر کا حسن بڑھاتے ہیں بلکہ آلودگی کم کرنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ اب تو شہر کی آلودگی بھی بڑھ گئی ہے کیوں کہ اکثر پرانی اور نئی کالونیاں اپنی آلائش اس کی گہرائیوں میں سمو دیتی ہیں۔ وہی نہر جس کا شفاف پانی آئینے کی طرح چمکتا تھا، اب ایک گندے نالے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ شاذب بھی انہی لوگوں میں شامل تھا جن کا دل نہر کے بتدریج ختم ہوتے حسن کو دیکھ کر کڑھتا تھا مگر وہ اس سلسلے میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ آج بھی وہ اسی سوچ میں ڈوبا چلا جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عجیب و غریب چھتری نما چیز پر پڑی۔ وہ بے خیالی میں اس کی طرف بڑھا اور اسے اچانک یاد آ گیا کہ اس نے کسی کتاب میں اُڑن طشتریوں کے بارے میں پڑھا تھا۔ ان کی وضع اس چھتری سے بہت ملتی تھی۔

"کیا یہ بھی اُڑن طشتری ہے......؟" اس نے وہاں رُک کر اس چھتری نما چیز کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسی لمحے اسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی انسان نما چیز چھتری کے نیچے دبی ہوئی تھی اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاذب فطرتاً ایک رحم دل اور دلیر لڑکا تھا۔ اس نے اس کو چھتری کے نیچے سے نکلنے میں مدد دی۔ تھوڑی سی محنت کے بعد وہ چیز چھتری کے نیچے سے نکل آئی۔ شاذب نے دیکھا کہ وہ کوئی چیز یا جانور نہیں بلکہ ایک خوب صورت انسان تھا لیکن اس کا قد تین فٹ

سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ انسان اس کی طرف بڑھا اور نہ جانے کون سی زبان میں کچھ کہا جسے شاذب بالکل نہ سمجھ سکا اور نہ ہی شاذب کی بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس کے بعد اس اجنبی نے اشاروں میں اپنی بات سمجھانی چاہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اشاروں کے ذریعے بات چیت کرنے لگے۔ اجنبی نے اسے بتایا کہ وہ ایک ایسے سیارے سے تعلق رکھتا ہے جس کے بارے میں دُنیا کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی دُنیا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ وہ تو اپنی اُڑن طشتری میں سیر کو نکلا تھا اور راستہ بھٹک گیا اور گھومتا گھامتا ادھر آ نکلا۔ اچانک اس کی اُڑن طشتری میں خرابی پیدا ہوگئی اور وہ طشتری سمیت نیچے آ گرا۔ چونکہ وہ اُڑن طشتری کے نیچے دب گیا تھا، اس لیے اسے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ شاذب نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی جو اس نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد قبول کر لی لیکن اس نے شاذب کو بتایا کہ وہ دُنیا والوں کے سامنے زیادہ نہیں آنا چاہتا۔ پتا نہیں دُنیا والوں کا اسے دیکھ کر ردِعمل کیا ہو۔ وہ انہیں اپنی بات اچھی طرح سمجھا بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اسے اپنے سیارے کی حکومت کی طرف سے بھی یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اجنبی لوگوں سے زیادہ گھلے ملے۔ جب شاذب نے خالص پاکستانی انداز میں اسے مشورہ دیا کہ اسے کیا ضرورت ہے کہ اپنی حکومت کو سب کچھ بتائے تو اس اجنبی شخص نے شاذب کو یہ کہہ کر شرمندہ کر دیا کہ وہ لوگ ہر حال میں اپنی حکومت کے قواعد وضوابط کا احترام کرتے ہیں اور اسی میں ان کی ترقی اور خوشحالی کا راز ہے۔ شاذب نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنے امی اور بابا کے سوا کسی اور کے سامنے آنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ وہ جب تک چاہے، اس کے گھر کے اوپر والے کمرے میں آرام سے رہ سکتا ہے۔ شاذب نے اپنے دوست کا نام کومیل رکھا کیوں کہ اس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ شاذب کی زبان پر چڑھتا ہی نہیں تھا۔ البتہ کومیل کو اس کا نام آسانی سے یاد ہوگیا۔ وہ یوں بھی بے حد ذہین تھا اور اتنی سی دیر میں اس نے شاذب کی زبان اُردو کے کئی الفاظ سیکھ لیے تھے۔ کومیل کے زخم کافی گہرے تھے لیکن وہ ڈاکٹر کو بلوانے پر کسی طور راضی نہ ہوا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا تو ایک فرسٹ ایڈ بکس شاذب کے سامنے آ گیا۔ شاذب نے بے حد حیران ہو کر کومیل کی طرف دیکھا۔ اس نے سکڑ کر آہستہ سے سر ہلا دیا اور شاذب کو بتایا کہ ان کے ہاں سب کو تھوڑا بہت جادو آتا ہے اور وہ لوگ اپنے بہت سے چھوٹے موٹے کام جادو کے ذریعے کر لیتے ہیں۔

شاذب کے ابو امی کومیل سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کومیل بھی ان سے بہت ادب اور پیار سے ملا۔ شاذب کی امی کے ہاتھ کا کھانا بھی کومیل کو بہت پسند آیا اور گاجر کا حلوہ تو اس نے بہت ہی شوق سے کھایا۔ اس کے لیے کھانوں کا یہ ذائقہ بالکل نیا تھا۔ رات کو بھی شاذب دیر تک کومیل سے باتیں کرتا رہا۔ اب تک کومیل اُردو زبان کے بہت سے لفظ سیکھ گیا تھا اور شاذب کو اس سے باتیں کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ اسے باتوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ اگلے دن اس کا ریاضی کا پیپر تھا۔ وہ نوماہی امتحان تھے یعنی مڈٹرم ایگزامز، مگر ہر پرچے میں پاس ہونا تو ضروری تھا۔ جب کومیل نے شاذب کو اتنا پریشان دیکھا تو کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیا۔ شاذب کو امتحانی ہال میں جا کر ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہوئی حالانکہ اس نے گزشتہ روز کتاب کو ہاتھ بھی لگا کر نہیں دیکھا تھا اور اتوار کی چھٹی کومیل کے ساتھ گزار دی تھی۔ جب اس کے سامنے امتحانی پرچہ آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسے تمام سوالات آتے تھے حالانکہ وہ ریاضی کے مضمون میں بہت اچھا نہیں تھا۔ اس پرچے میں اور اگلے فزکس کے پرچے میں اس کے 90 فیصد نمبر آئے اور شاذب اپنے دوست کا بے حد شکر گزار ہوا کہ وہ بغیر پڑھے اتنے اچھے مارکس لے کر پاس ہوگیا تھا۔ امتحانوں کے چند دن بعد شاذب کا کرکٹ میچ تھا۔ اس کی ٹیم کا مقابلہ ایک ایسی ٹیم سے تھا جو کرکٹ میں پورے ضلع میں اوّل درجے پر تھی اور آج تک کوئی ٹیم بھی اسے ہرا نہیں سکی تھی۔ خود شاذب بھی بہت اچھا کھلاڑی نہیں تھا۔ وہ صرف اس لیے اپنے اسکول کی ٹیم میں تھا کہ اس کی سفارش اس کے ابو کے دوست نے کی تھی جو ڈی آئی جی پولیس تھے۔ پھر ان کے اسکول میں کرکٹ کے اچھے کھلاڑیوں کی کمی بھی تھی۔ کومیل کے جادو کے زیرِ اثر شاذب نہ صرف دوسری ٹیم کے کھلاڑیوں کو آسانی سے آؤٹ کر سکا بلکہ اس نے بڑی آسانی سے سنچری بھی بنا لی اور مین آف دی میچ قرار دیا گیا۔ شاذب کے اسکول کے لڑکوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا اور پورے گراؤنڈ کا چکر لگایا۔ ہر طرف شاذب زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے تھے لیکن

شاذب دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ اسے یہ کامیابی اپنی وجہ سے نہیں بلکہ کومیل کے جادو کی وجہ سے ملی ہے۔

کومیل جب چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو دونوں نے جا کر اُڑن طشتری کا جائزہ لیا جسے وہ ایک گھنی جھاڑی کے نیچے چھپا آئے تھے۔ کومیل نے شاذب کو بتایا کہ اُڑن طشتری میں کوئی خرابی نہیں ہے اور وہ سفر کے قابل ہے۔ اب کومیل کو اپنے سیارے پر واپس جانا تھا اور شاذب بے حد اداس تھا۔ شاذب کی فرمائش پر کومیل نے ہامی بھر لی کہ وہ اپنی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ کومیل نے اپنی اُڑن طشتری میں اسے اپنے سیارے کا چکر لگوایا۔ شاذب اس سیارے کی صفائی اور خوب صورتی دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ وہ سیارہ پاکستان کی طرح خوب صورت اور سرسبز و شاداب نہیں تھا۔ نہ وہاں اونچے اونچے پہاڑ تھے اور نہ چاندی کی طرح بہتے جھرنے، نہ تیز رو دریا اور نہ ہی ہری بھری پھلوں اور پھولوں سے بھری ہوئی وادیاں۔ نہ صحرا اور نہ سمندر لیکن وہاں ہر طرف امن و سکون تھا، چین تھا۔ چھوٹے چھوٹے شہر صاف ستھرے تھے۔ مکان، گلیاں اور سڑکیں ترتیب سے بنی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک منظم تھی۔ گاڑیاں چلانے والے نہ بے تکے پن سے گاڑیاں دوڑاتے تھے اور نہ ہی پیدل چلنے والوں کو تنگ کرتے تھے۔ ہر طرف نظم و ضبط تھا۔ سڑکیں اور گلیاں صاف ستھری تھیں۔ گندگی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ پارکوں میں بے شمار لوگ پھر رہے تھے۔ بچے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن مجال تھی کہ کوئی چھلکا یا ریپر غلط جگہ پڑا نظر آ جائے۔ کوئی درختوں پر لگے پھلوں اور کیاریوں میں کھلے پھولوں کو نہیں چھیڑتا تھا۔ لڑائی جھگڑے اور دنگے فساد کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ لوگ دھیمی آوازوں میں ہنس بول رہے تھے۔ کسی کے ماتھے پر نہ شکن تھی اور نہ ہی کوئی پریشان نظر آتا تھا۔ نہ ڈر، نہ خوف۔ گول مٹول صحت مند بچے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کسی کو ان کی حفاظت کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہاں کوئی اغوا کار موجود نہیں تھا۔ لوگوں کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کوئی چور اچکا ان کی کوئی چیز لے اڑے گا یا کوئی ڈاکو ان پر حملہ کر دے گا۔ عورتیں آزادی سے گھوم رہی تھیں اور اپنے کام کر رہی تھیں۔ کومیل نے شاذب کو بتایا کہ ان کے ہاں جرم کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ چوری، بے ایمانی، رشوت، دغا بازی اور قتل و غارت ناپید ہے۔ سب لوگ اپنا اپنا کام ذمہ داری، ایمان داری اور جاں فشانی کے ساتھ کرتے ہیں، اسی لیے ان کے ہاں ہر شعبے میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ انہیں اپنی ضرورتوں کے لیے کسی دوسرے ملک کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا اور نہ ہی کوئی دوسرا ملک ان پر اپنا دباؤ اور قبضہ رکھنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ ہر میدان میں خود کفیل ہیں اور کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ شاذب کو اس سیارے پر آ کر ایسا
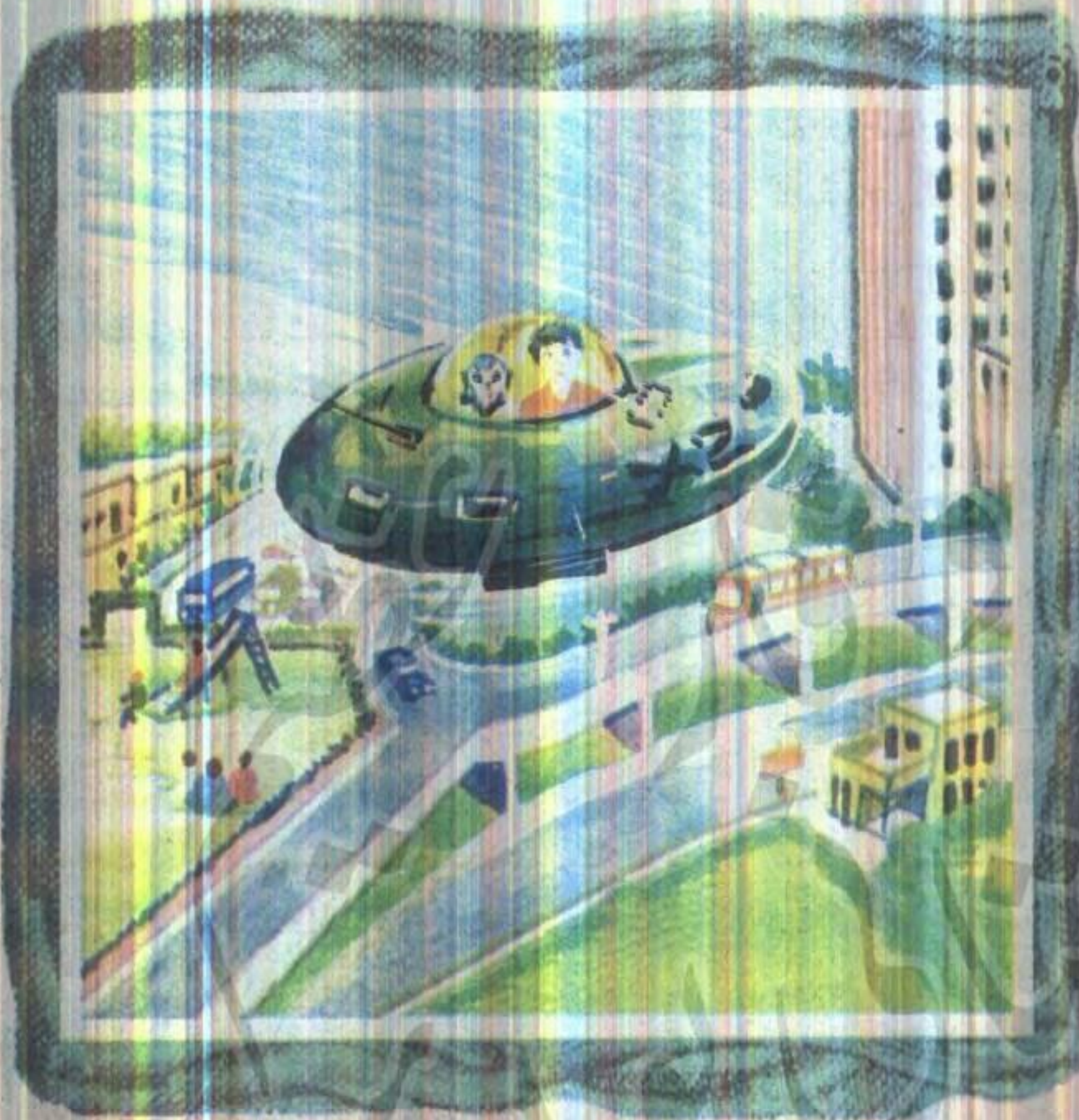
لگ رہا تھا جیسے وہ جنت میں آ گیا ہو۔ ہر طرف امن، سکون، شادمانی اور کامرانی۔ "کاش! ہماری سرزمین بھی ایسی ہو جائے۔" اس نے حسرت سے سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان لوگوں کے لیے یہ سب کیا مشکل ہے، وہ تو جادو کے زور سے سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں تو پھر یہ لوگ اتنی محنت مشقت کیوں کرتے ہیں، انہیں اسکولوں اور کالجوں کی کیا ضرورت ہے اور نہ انہیں کارخانوں، فیکٹریوں، دفاتر اور دوسرے بڑے بڑے اداروں کی ضرورت اور نہ ہی انہیں اسپتال چاہئیں۔ وہ تو جادو کے بل بوتے پر اپنی ہر مشکل آسان کر سکتے ہیں۔ اپنی ہر ضرورت، ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنے خیال کا اظہار کومیل سے کیا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ "نہیں میرے دوست، ہم نے یہ سب کچھ جادو کے بل پر نہیں بلکہ عقل، سمجھ بوجھ اور محنت مشقت سے حاصل کیا ہے۔ ہم نے اپنے سیارے کو ترقی یافتہ بنانے میں بے تحاشا محنت کی ہے، بے پناہ جدوجہد کی ہے کیوں کہ ہمارے پاس تمہاری طرح سمندر، دریا، پہاڑ، جھیلیں، زرخیز زمین اور قدرتی وسائل نہیں ہیں۔ ہمارے پاس تو پانی کی بھی کمی تھی۔ ہم نے باہمی اتفاق، اتحاد، ایمان داری، ذمہ داری اور خلوص و محنت کے ساتھ کام کیا ہے اور اپنی مشکلات پر قابو پا لیا ہے۔ عزیز دوست! جادو تو ایک وقتی چیز ہے۔ تھوڑے عرصے کے لیے اپنا اثر رکھتا ہے۔ اسے تو ہم یونہی دل بہلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اصل جادو تو ہمارے ہاتھوں میں ہے جس کے ذریعے ہم نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ تم ہمارے سیارے کو دیکھ کر اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو۔ تم نے اپنی دُنیا میں چین، جاپان اور کوریا کی مثالیں نہیں دیکھیں۔ جاپان کے پاس بھی تو قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں مگر کیا وہ تمہاری دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں سے نہیں ہے۔ چین تمہارے بعد آزاد ہوا تھا لیکن اب وہ تمہارے ملک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ میں نے اُڑن طشتری میں سفر کرتے ہوئے تمہارے ملک کے حسین ترین مقامات بھی دیکھے ہیں اور وہاں پر گندگی، غلاظت اور بدنظمی کا راج بھی دیکھا ہے۔ میں نے سیف الملوک جھیل کے شفاف نیلگوں، آئینے کی طرح چمکتے پانی پر چھلکے، گندے لفافے اور ریپرز تیرتے دیکھے ہیں۔ زمردیں گھاس کے قالین کو غلیظ ہوتے دیکھا ہے۔ پارکوں میں غلاظت دیکھی ہے۔ سڑکوں پر گندگی کا ڈھیر میری نظروں سے گزرا ہے۔ تمہارے ملک میں ہر طرف چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کا راج ہے۔ اس معاملے میں عوام اور حکومت یکساں بے بس ہیں۔ مجرم دندناتے پھرتے ہیں، قانون ناپید ہے مگر میں نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ دھماکے کے بعد سڑکوں پر لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ دھماکے ہو رہے ہیں لیکن لوگ اپنی جانوں کی پرواہ کیے بغیر دوسروں کی زندگیاں بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

زلزلے اور سیلاب کی تباہیوں کے بعد وہ تمہارے ہی لوگ تھے جنہوں نے دن رات کام کیا ہے اور مصیبت زدوں کی مدد کی ہے۔ ان لوگوں کے پاس کوئی جادو نہیں تھا، صرف ہم دردی اور ذمہ داری کا احساس تھا۔

جادو کے زور سے ہم چھوٹے چھوٹے شعبدے تو دکھا سکتے ہیں، اپنی مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے۔ میں نے جادو کے زور سے تمہاری تھوڑی بہت مدد کر دی لیکن ایک کام یاب انسان بننے کے لیے تمہیں خود محنت کرنا ہو گی۔ میری ایک بات یاد رکھنا میرے دوست، ہم سب کو اپنے حصے کا کام خود کرنا ہوتا ہے۔ وہ قوم جو اپنی ذمہ داری حکومت پر یا دوسروں پر ڈال کر سبکدوش ہو جاتی ہے، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس دُنیا میں ہر شخص کو خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو یا کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اپنے حصے کا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ اسی صورت میں کسی قوم کی حالت سدھاری جا سکتی ہے۔"

کومیل نے شاذب کو زمین پر اتار دیا، اب کومیل کو واپس جانا تھا۔ شاذب اس کی جدائی کے خیال سے بہت اداس تھا۔ اس نے کومیل سے کہا کہ وہ دوبارہ اس سے ملنے ضرور آئے۔ کومیل نے مسکرا کر کہا۔ "میں وعدہ نہیں کرتا مگر کوشش ضرور کروں گا، تم میری ایک بات یاد رکھنا۔ اپنا کام پوری ایمان داری اور محنت سے کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر انحصار نہ کرنا۔ یہی کام یابی کا راز ہے۔" یہ کہہ کر کومیل اپنی اُڑن طشتری میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ اُڑن طشتری دھیرے دھیرے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور آسمان پر صرف ایک نکتہ رہ گیا۔ شاذب اس نکتے پر نظر جمائے سوچ رہا تھا۔ "ہاں کومیل میں اپنے حصے کا کام پوری جاں فشانی سے کروں گا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کروں گا۔ انشاء اللہ وہ وقت بہت جلد آئے گا جب ہر پاکستانی کو اپنے ملک کے لیے ذمہ داری کا احساس ہو گا اور ہمارا پاکستان جنت نظیر بن جائے گا۔"

بلا عنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جولائی 2013ء ہے۔
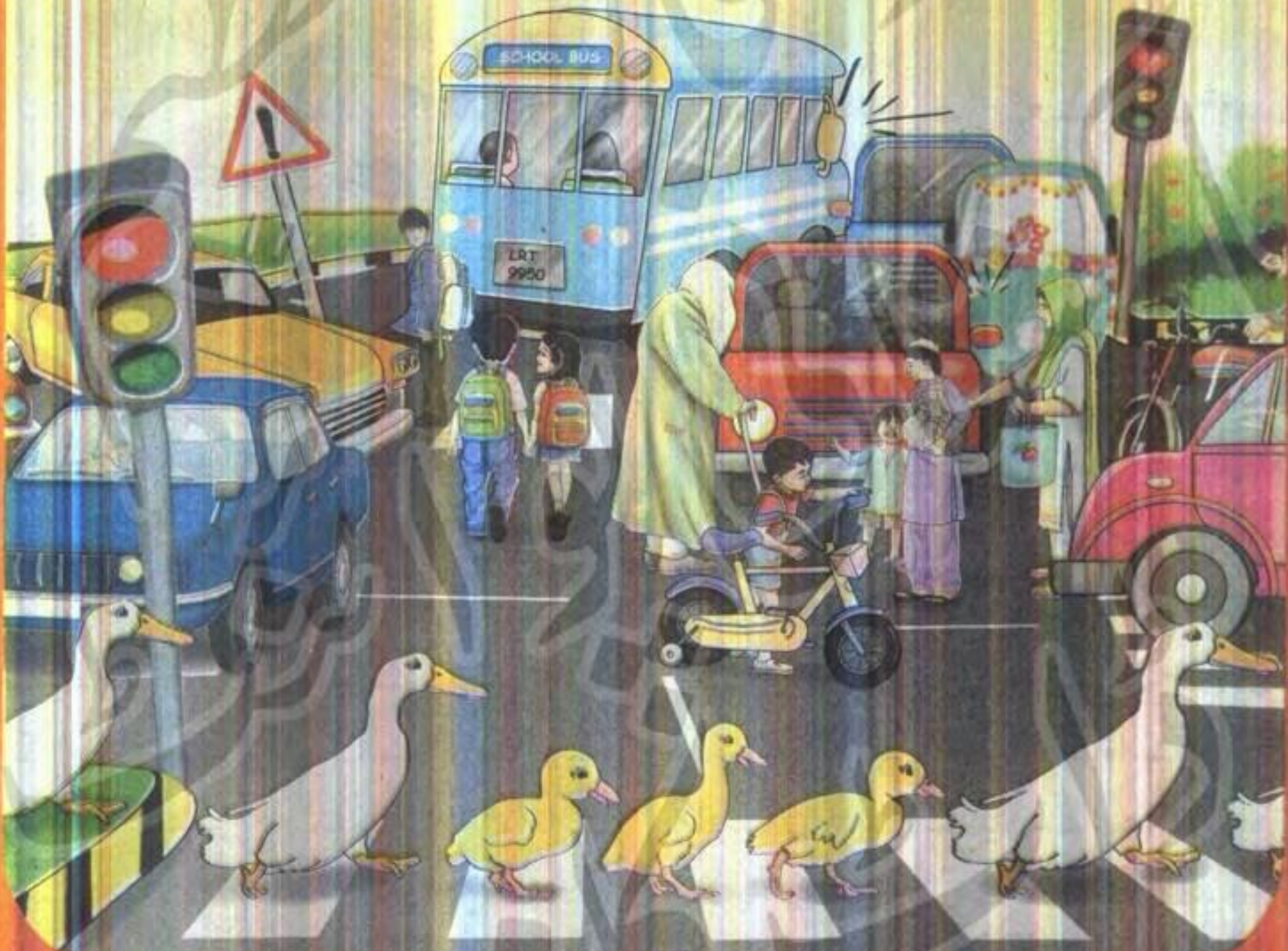
جون 2013ء کے ''بلا عنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔
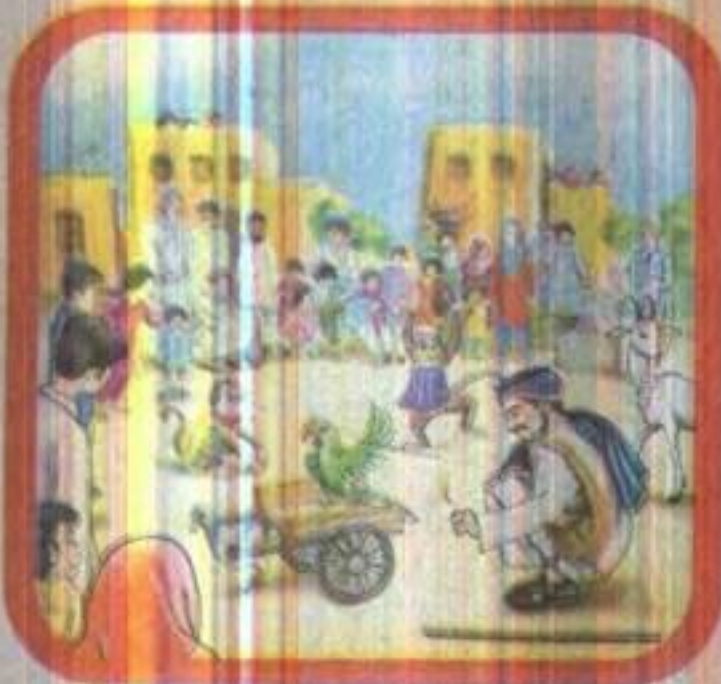
- آج دیکھیے نیا شاہ کار، کبوتر گاڑی پر ہے طوطا سوار (سلیمان علی عمر، راول پنڈی)
- تماشا ہو کیسا؟ سب بولیں ایسا...... (قدسیہ وقار، لاہور)
- چل میرے لال، دکھا دے اپنا کمال (محمد صدام حسین قادری، کاموںکے)
- آؤ بچو دیکھو مداری، کبوتر چلائے گاڑی، طوطا کرے سواری (ثمر اقبال ملک، سرگودھا)
- طوطا کرتب دکھائے، مداری پیسے کمائے (محمد ابراہیم خاور، اٹک کینٹ)

محمد سہیل علی، شیخوپورہ (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

عاتکہ نور، اسلام آباد (دُوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

مناہل ممتاز، گوجرانوالہ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)
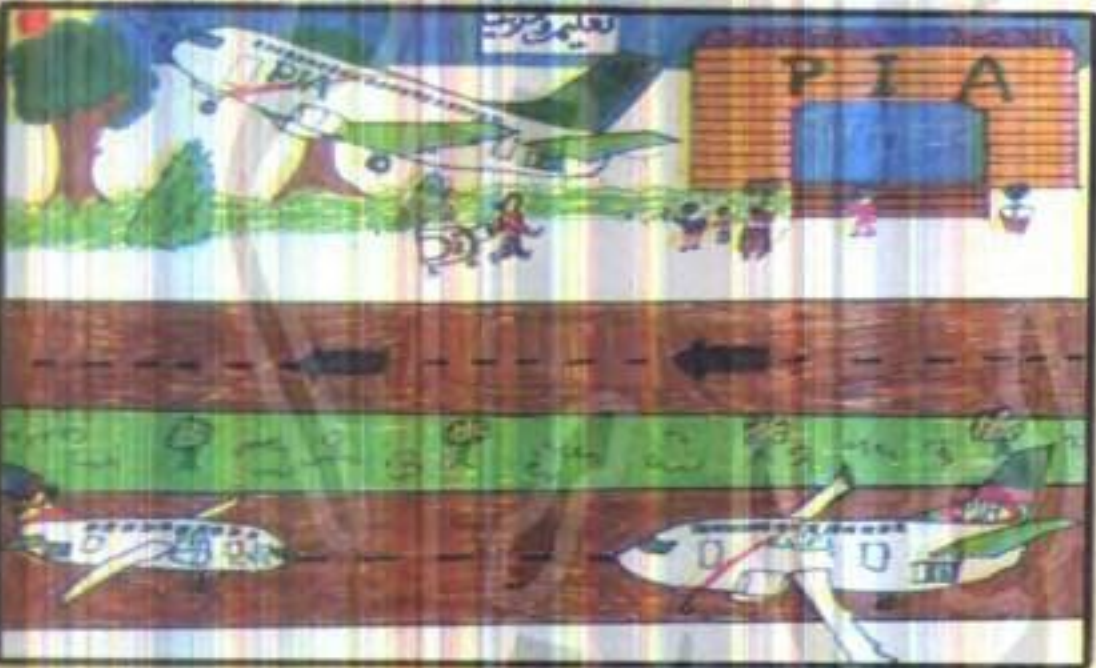
محمد احمد جواد، بہاول نگر (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

ہادیہ نثار، میرپور، آزاد کشمیر (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

مومنہ احسن، فیصل آباد (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: سید ایان بخاری، کلورکوٹ۔ ملیحہ رحمٰن رانا، بھکر۔ عائشہ ہاشمی، میاں والی۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ کشف عروج، تلہ گنگ۔ جویریہ رحمٰن رانا، کلورکوٹ۔ محمد عبداللہ گل، راول پنڈی۔ جویریہ رمشاء، چتوکی۔ راجہ زین طارق، راول پنڈی۔ سلیمان علی، راول پنڈی۔ محمد عرفان، سیال کوٹ۔ عائشہ صدیقی، لاہور۔ رمشاء عمران، پشاور۔ ماہ نور جاوید، کوہاٹ کینٹ۔ صباحت تنویر، پشاور۔ عدینہ فرحان، لاہور۔ محمد امیر حمزہ، دریا خان۔ محمد وقار وکیل، دریا خان۔ مامون عامر، لاہور۔ رابعہ حسن، چکوال۔ محمد اسامہ وحید، ہری پور۔ صفا رشید، کراچی۔ لبیبہ فاطمہ، راول پنڈی۔ انیقہ اسحاق، راول پنڈی۔ محمد طیب ریاض، اسلام آباد۔ عائیزہ ممتاز، لاہور۔ محمد سعد نوید، فیصل آباد۔ منیبہ بتول، جہلم۔ امیر حیدر، تونسہ شریف۔ لبیب احمد، ڈی جی خان۔ نفیس احمد صدیقی، لاہور۔ محمد سلیم چغتائی، لاہور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جولائی کا موضوع
مٹھائی کی دکان
آخری تاریخ 8 جولائی

اگست کا موضوع
اسکول
آخری تاریخ 8 اگست